دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۱ ماہ شعبان المعظم ۱۴۳۴ھ مطابق ماہ جون ۲۰۱۳ء عدد ۶

فہرست مضامین

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

جون علامہ شبلی کی پیدائش کا مہینہ ہے۔اسی مہینہ میں اس نادرہ روزگار نے اس عالم آب و گل میں آنکھیں کھولیں اور ایک مختصر سی فرصت حیات میں ''ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پرشور رکھا''۔ وہ خود فرماتے ہیں:

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ زا خواہد بود زیں نواہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ ام

ان کی خدمات اور اکتسابات کا دائرہ بہت وسیع اور متنوع ہے۔اس کا ایک بہت روشن پہلو مختلف علمی اور تعلیمی اداروں کی منصوبہ بندی اور ان کی تاسیس و تعمیر ہے۔انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی علمی اور تعلیمی ضروریات اور ان کے مقتضیات کا صحیح طور پر ادراک کیا اور ان کی تکمیل کے لیے مختلف نوعیت کے اداروں کا خاکہ بنایا، ان کی منصوبہ بندی کی اور کمزور صحت اور گوناگوں مسائل اور مشکلات کے باوجود ان کی صورت گری میں بڑی جدوجہد اور جانفشانی کی۔انہوں نے جو ادارے قائم کیے نیز وہ ادارے جو ان کی توجہ اور کوشش سے علمی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام بنانے میں کامیاب ہوئے ان میں زمانی لحاظ سے تقدم اور اولیت کا شرف نیشنل اسکول، اعظم گڑھ، کو حاصل ہے جو اب شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کا خوبصورت قالب اختیار کر چکا ہے اور علاقہ کے تعلیمی اداروں کے درمیان ایک امتیازی مقام کا حامل ہے۔واقعہ یہ ہے کہ اس کالج نے خطہ میں تعلیم کی توسیع و ترویج میں بڑا گراں قدر کردار ادا کیا ہے۔اس ادارہ کی تاسیس بھی اسی ماہ جون میں ہوئی۔ابھی علامہ شبلی کو علی گڑھ آئے بہ مشکل چار مہینہ کا عرصہ گذرا تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کی ضرورت کو اس شدت سے محسوس کیا کہ اس کے لیے فوری طور پر عملی قدم اٹھانے کے لیے تیار ہوگئے اور ۲۰/جون ۱۸۸۳ء کو نیشنل اسکول کی بنیاد ڈال دی۔اس طرح اس اسکول کا قیام علی گڑھ تحریک کی برکات میں شامل ہے۔اس سلسلہ میں اہم بات یہ ہے کہ یہ اسکول مدرسۃ العلوم کے قیام کے صرف ۸ سال بعد قائم ہوگیا تھا۔اس طرح مدرسۃ العلوم کے بعد علی گڑھ تحریک کے زیر اثر قائم ہونے والا غالباً یہ پہلا اسکول تھا اور یہ ایک بڑا فخر ہے جو اس ادارہ کو حاصل ہے۔بعد میں اس تحریک کے زیر اثر ملک کے طول و عرض میں بے شمار تعلیمی ادارے قائم ہوئے لیکن اولیت کی فضیلت شہر اعظم گڑھ میں علامہ شبلی کے ہاتھوں قائم ہونے والے اس اسکول ہی کو حاصل ہے۔طبقہ علماء کے ایک فرد کا اُن مخصوص حالات میں جب جدید تعلیم کا حصول کفر سے کم تصور نہیں کیا جاتا تھا، اس کی ضرورت اور اہمیت کا اتنا شدید احساس جہاں ان کی روشن خیالی کا پتہ دیتا ہے وہیں ملت اور اس کے مسائل کے تئیں ان کی گہری فکرمندی اور دل سوزی کا بھی غماز ہے۔اس کے علاوہ اس وقت جب کہ ۱۸۵۷ کے زخم ابھی رس رہے تھے اور

کانگریس کی تاسیس میں ابھی دو سال کا عرصہ باقی تھا، کسی ادارے کے ساتھ لفظ نیشنل کا استعمال بڑی جرأت کا کام تھا۔ اس ادارہ کی سکریٹری شپ کی ذمہ داری انہوں نے خود سنبھالی، خاندانی جائداد سے اس کے لیے زمین فراہم کی، اعزہ اور احباب کو ممبر بنایا اور اس کی تعمیر کے لیے ان سے چندے لیے اور پوری زندگی اس کی ترقی کے لیے فکرمند اور کوشاں رہے۔ اس اسکول کے لیے ان کی فکرمندی کا اندازہ احباب اور اعزہ کے نام ان کے خطوط سے لگایا جاسکتا ہے۔ اسکول کی تاسیس کے علاوہ تعلیم کی توسیع کے لیے ان کی فکرمندی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ''موازنہ قومی'' کے نام سے ایک مجلس قائم کی۔ اس کی طرف سے ہر سال تعلیمی ترقی کی روداد مرتب ہوتی اور اطلاع عام کے لیے لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھی۔

اس اسکول نے محض ایک استاد اور تین طالب علموں سے کام شروع کیا۔ علامہ کی ذاتی توجہ اور دلچسپی کی وجہ سے اس کے حالات بہتر ہوتے گئے۔ چنانچہ یہ اسکول اپنی تاسیس کے چار سال بعد مڈل اسکول ہوگیا اور ۱۸۹۵ میں ہائی اسکول تک ترقی کر گیا۔ اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اسکول ترقی کے بجائے تنزل کا شکار ہوگیا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک کے خاصے طویل عرصے میں علامہ شبلی ندوہ کی تعمیر و ترقی میں اس حد تک مصروف و منہمک رہے کہ انہیں اسکول کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں ملی اور اس اسکول کو جس سے ان کو بڑی محبت تھی بھول سے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسکول کے حالات شدید ابتری کا شکار ہوگئے اور وہ ہائی اسکول کی سطح سے گر کر پھر مڈل اسکول ہوگیا۔ ۱۹۱۳ میں ندوہ سے سبک دوشی کے بعد انہوں نے اس اسکول کی طرف پھر توجہ کی۔ اس کام میں ان کے دست و بازو ان کے چھوٹے بھائی محمد اسحاق صاحب، بیرسٹر الٰہ آباد ہائی کورٹ تھے۔ ان کے مشورے اور تعاون سے انہوں نے اسکول کی ترقی اور خطہ میں تعلیم کی ترویج کے لیے کئی منصوبے بنائے۔ ۱۹۱۴ میں الٰہ آباد ہائی کورٹ میں گرمیوں کی تعطیل کے دوران علاقہ میں تعلیم کی توسیع کے لیے ایک بڑا منصوبہ تیار ہو چکا تھا۔ اس میں اعظم گڑھ میں ایک تعلیمی کانفرنس اور علاقہ کے تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت افراد سے وسیع پیمانے پر رابطہ کا پروگرام شامل تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی اسحاق صاحب کا انتقال ہوگیا اور چند مہینہ بعد ہی خود علامہ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ البتہ انتقال سے پہلے اسحاق صاحب نے ادارہ کی دیکھ ریکھ کے لیے ایجوکیشنل سوسائٹی کی بنیاد ڈال دی تھی۔ احباب و اعزہ نے ان بزرگوں کی اس یادگار کی تعمیر و ترقی میں دلچسپی لی۔ ۱۹۴۰ میں اسے انٹر کالج کا درجہ ملا۔ کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے حبیب شبلی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدر یار جنگ کا انتخاب کیا گیا۔ علامہ شبلی سے تعلق خاص کی وجہ سے وہ ابتدا ہی سے دارالمصنّفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن رکین تھے۔ ایک پروقار تقریب میں ان کے ہاتھوں کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ کالج کی تعمیر

میں علامہ کے شاگرد اور دارالمصنفین کے منیجر مولانا مسعود علی ندوی نے کلیدی کردار ادا کیا۔ پوری عمارت ان کی کوشش سے اور ان کی نگرانی میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ استاد کے ہاتھوں قائم کیے جانے والے اس ادارہ سے ان کو بڑا تعلق خاطر تھا۔ اس عمارت کی تعمیر ان کی انتھک محنت کا ثمرہ ہے اور اس میں ان کے حسن ذوق کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کالج کی تعمیر و ترقی کے سلسلہ میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ۱۹۴۶ کے ہنگامہ خیز دنوں میں اسے ڈگری کالج کا درجہ ملا۔ اس کا کریڈٹ بنیادی طور پر بشیر احمد صدیقی صاحب کو جاتا ہے جو اس وقت پرنسپل تھے۔ ۱۹۷۰ میں کالج کے فعال اور نامور پرنسپل مرزا شوکت سلطان صاحب کی مساعی جمیلہ سے اسے پوسٹ گریجویٹ کالج کا مرتبہ حاصل ہوا۔

اس مہینہ میں اس ادارہ کی تاسیس پر ۱۳۰ سال پورے ہو رہے ہیں۔ اس طویل مدت میں ملک میں ہر نوع اور معیار کے ہزاروں تعلیمی ادارے اور سینکڑوں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ آزادی کے بعد ملک نے تعلیم کے میدان میں بڑی ترقی کی ہے۔ حکومت ہند تعلیم کے فروغ پر غیر معمولی وسائل صرف کر رہی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی کی رفتار خاص طور سے بہت تیز ہے۔ اسی تناسب سے ان موضوعات پر اعلی اور تخصیصی تعلیم کے میدان میں کام کرنے والے اداروں کے لیے ترقی کے مواقع اور امکانات بھی بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ جو ادارے ابھی چند دہوں بلکہ چند برسوں پہلے قائم ہوئے وہ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں اور ان کی ترقی کی رفتار کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ستاروں سے آگے کے جہانوں کی جستجو میں سرگرداں ہیں۔ پورے ملک میں تعلیم کے میدان میں غیر معمولی سرگرمی نظر آرہی ہے۔ بدقسمتی سے علامہ شبلی کا قائم کیا ہوا یہ قدیم ادارہ اعلی تعلیم کے میدان میں دستیاب ان مواقع اور امکانات سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ جو آگے نہیں بڑھتا وہ پیچھے ہٹتا ہے۔ کوئی شخص یا ادارہ طویل مدت تک ایک ہی جگہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ یہ قانون قدرت ہے۔ علامہ شبلی سے محبت، ان کی یاد سے وفاداری اور ان کے تعلیمی مشن سے وابستگی کا تقاضا ہے کہ ان کی اس یادگار کی ہمہ جہت ترقی اور اسے ایکسیلنس کا مرکز بنانے کے لیے کسی بھی امکانی کوشش سے دریغ نہ کیا جائے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل نہایت پیچیدہ اور گوناگوں ہیں، لیکن شاید اس امر میں بہت زیادہ اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ ان میں سب سے بڑا مسئلہ ہماری نئی نسلوں کو معیاری تعلیم فراہم کرنے کا ہے۔ اگر نومبر ۱۹۱۴ تک اس ادارہ کی ترقی کے محاذ پر کوئی نمایاں کامیابی حاصل کرلی جاتی ہے اور یہ کالج ایک اعلیٰ درجہ کے تعلیمی مرکز کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتا ہے تو نہ صرف یہ کہ علامہ کے تعلیمی مشن کی تکمیل کی جہت میں یہ ایک بڑا اقدم ہوگا بلکہ سویں برسی کے موقع پر علم اور تعلیم کے اس شیدائی کے لیے قوم کی طرف سے شایان شان خراج عقیدت بھی۔ وقت بہت تیزی سے گذر رہا ہے۔ اس لیے اس محاذ پر فوری، موثر اور فیصلہ کن اقدام کی ضروری ہوگیا ہے۔

مقالات

پہلی صدی ہجری میں سیرت نگاری کا ارتقاء اور حضرت ابان بن عثمانؓ کی مغازی

ڈاکٹر محمود الحسن عارف

حدیث اور سیرت کا طالب علم یہ جانتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ''سیرت طیبہ'' کی تدوین وتالیف پر کام تو اسی دن شروع ہو گیا تھا، جس دن اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو منصب نبوت پر سرفراز کیا تھا؛ اور جیسے ہی آپؐ اولین وحی الٰہی کا تحمل فرما کر واپس تشریف لائے تھے، تو ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی جن پاکیزہ الفاظ میں پذیرائی اور حوصلہ افزائی کی تھی، اسی سے آپ کی سیرت نگاری کی ابتدا ہوگئی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا، **کلا و اللّٰہ لا یخزیک اللّٰہ ابدًا انک لتصل الرحم و تحمل الکل و تکسب المعدوم و تعین علیٰ نوائب الحق** ۔(۱) ہرگز نہیں، بخدا اللہ رب العزت آپؐ کو کبھی بھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ تو صلہ رحمی کرتے، مقروض کا بوجھ اٹھاتے، غرباء کو کما کر دیتے اور ضرورت مندوں کی مصیبت کے وقت مدد کرتے ہیں۔

ابتدائی زمانے، یعنی عہد صحابہؓ میں یہ کام بغیر کسی واضح نام یا عنوان کے محض ''حدیث'' کے عنوان کے تحت جاری رہا اور دوسرے علوم وفنون کی طرح اس کی ابتدائی نشو ونما بھی ''علم الحدیث'' کے تحت انجام پاتی رہی۔

لیکن جلد ہی دوسرے علوم وفنون کی طرح آنحضورؐ کی سیرت طیبہ کی تدوین ''سیرت'' اور ''مغازی'' کے عنوانات کے تحت ہونے لگی۔ آگے بڑھنے سے پہلے دونوں الفاظ کا لغوی تجزیہ ملاحظہ ہو۔

ا۔ سیرت کے لغوی اور اصطلاحی معنی: لفظ ''سیرت'' کا مادہ س۔ی۔ر (سار یسر

شعبۂ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

سیراً و مسیراً) ہےاوراس کےلغوی معنی ہیں چلنا، پھرنا چنانچہ عصر حاضر کی ایک جدید ڈکشنری میں سارَ کے معنی تحرّک(be in motion) اشتغل (مشغول ہونا، be in action)، وغیرہ کے ہیں، جبکہ سیرۃ کے معنی رویےاورانداز(canduct, behavior) کے ہیں ۔(۲)

معروف ماہرلسانیات الزبیدی کے مطابق ''السیر'' کے معنی جانے اور سفر کرنے کے ہیں، خواہ یہ سفردن میں ہو یارات میں(السیّر الذھاب نھاراً او لیلاً) اورالمسیرۃ کے معنی مسافت کے ہیں جیسے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: نصرت بالرعب مسیرۃ شھرٍ۔(میری ایک ماہ کی مسافت سے رعب کے ساتھ مدد کی گئی ہے)۔(۳)

قرآن کریم میں لفظ ''سیرت'' کا استعمال حالت اور کیفیت کے مفہوم میں ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: سَنُعِیْدُ ھَا سِیْرَتَھَا الْاُولیٰ......(۴) ہم اسے اس کی ابتدائی حالت پر لوٹادیں گے۔

نامور محقق اور قرآنی مفردات کے ماہر امام راغب الاصفہانی لفظ سیرت کے تحت فرماتے ہیں ''السیر کے معنی زمین پر چلنے کے ہیں اور چلنے والے آدمی کو سائر اور سیار کہا جاتا ہے، اور ایک ساتھ چلنے والوں کی جماعت کو ''سیارہ'' کہتے ہیں(۵)، چنانچہ قرآن حکیم میں ہے، وَجَاءَ ت سیارۃ (۶) (اس کنویں کے قریب ایک قافلہ آیا) اور سیرت کے معنی ہیں، چلنا اور سیر بفلان کے معنی چلانے کے ہیں(۷) اس طرح قرآن کریم میں یہ لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے۔ (۸)

محققین کے مطابق لفظ سیرت کا سب سے پہلے استعمال آنحضورؐ کے اس طرز عمل کے لیے ہوا، جو آپؐ نے غیر مسلموں سے معاملہ کرنے اور صلح و جنگ کے معاملات میں اپنایا، چنانچہ معروف محقق قاضی محمد بن اعلیٰ التھانوی، اپنی کتاب کشاف اصطلاحات الفنون میں لکھتے ہیں: ثُمّ غلبت فی الشرع علیٰ طریقۃ المسلمین فی العاملۃ مع الکافرین والباغین وغیرھما من المستامنین والمرتدین واَھُل الذمہ پھر شریعت میں اس لفظ کے مفہوم پر مسلمانوں کا وہ طریقہ کار غالب آ گیا، جو وہ کافروں، باغیوں اور ایسے غیر مسلموں سے، جو پناہ لے کر اسلامی حکومت میں رہتے ہیں۔ نیز مرتدوں اور ذمیوں سے روا رکھتے ہیں اور یہی بات

نامور حنفی فقیہ کمال بن ہمام نے بھی لکھی ہے۔اسی طرح اس سے بعض علما کے مطابق جسمانی اور بعض کے مطابق فکری سیاحت مراد ہے۔(۹)

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ سیرت میں بڑی فکری وسعت پائی جاتی ہے، چنانچہ ماہرین سیرت کے مطابق لفظ ''سیرت'' کے درج ذیل معانی ہیں:

۱۔ چلنا، جانا، روانہ ہونا۔۲۔ سنت، طریقہ، روش۔۳۔ مذہب ومسلک۔۴۔ھیئت و شکل۔ ۵۔ حالت و کیفیت۔ ۶۔ کردار وعمل۔ ۷۔ کہانی، واقعہ، پرانے لوگوں کے قصے اور واقعات، جیسے سیرت سیف بن ذی یزن۔۸۔خصوصیت کے ساتھ آنحضورؐ کے مغازی کا بیان اور بعدازاں۔۹۔آنحضورؐ کے طریقے کا بیان، جوقرآن حکیم میں صلح اور جنگ میں آپؐ نے غیرمسلموں کے ساتھ روا رکھا۔اور آخری صورت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام حالات کا بیان،یعنی سوانح عمری۔(۱۰)

ان معانی میں سب سے آخر میں جومفہوم دیا گیا ہے، وہی اس لفظ کا اصطلاحی مفہوم ہےیعنی نبی اکرمؐ کے حالات زندگی آپ کے رویئے اورمختلف کاموں کوکرنے کا آغاز اس طرح یہ لفظ اپنے اندر بڑی معنوی وسعت اورشان وشوکت رکھتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنی فارسی کتاب عجالۂ نافعہ میں سیرت کی تعریف یوں کی ہے:

آنچہ متعلق بہ وجود پیغمبرؐ وصحابہ کرامؓ وآل عظامؓ است واز ابتدائے تولد آں جناب تا غایت وفات آں راسیرت می گویند۔(۱۱)

یعنی جو باتیں نبی اکرمؐ،صحابہ کرامؓ، آپؐ کے خاندان اورآنحضورؐ کی پیدائش سے آپؐ کی وفات تک کے حالات سے تعلق رکھتی ہیں، وہ سیرت ہے۔

لیکن اب سیرت طیبہ کامفہوم اس سے بہت زیادہ وسعت اختیار کرگیا ہےاوراس میں آپؐ کی تعلیمات، آپؐ کے متعلق قدیم انبیاء کی پیش گوئیاں آپؐ کے بزرگوں کے حالات، نیز عرب جغرافیہ وغیرہ امور بھی سیرت نگاری میں شامل ہیں.

۲۔مغازی کا لغوی اوراصطلاحی معنی: جبکہ دوسرا لفظ ''مغازی'' ہے، جوابتدائی دنوں میں

اس مقصد کے لیے یا زیادہ صحیح الفاظ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ''غزوات'' کے لیے استعمال ہوتا رہا، عجیب بات یہ ہے کہ اس کے لغوی معنی بھی حرکت اور سفر کرنے کے ہیں۔ چنانچہ غزا یغزو غزواً و غزواۃً کا مطلب ہے کسی شے کا ارادہ کرنا اور اس کو طلب کرنا اور الغزوۃ (حرف غین پر زیر کے ساتھ) وہ شے جس کا قصد اور ارادہ کیا جائے، جبکہ غزو کے معنی ہیں ''دشمن سے لڑنے اور اس کا سامان لوٹنے کی غرض سے اس کی طرف بڑھنے کے ہیں اور لڑنے والے کو غازی (جمع غزاۃ ، غزاً) بھی کہا جاتا ہے، جبکہ مغازی کے معنی غازیوں کے فضائل و مناقب کے ہیں، جبکہ الازھری کے مطابق مغزیٰ اور مغازی کے معنی ''جائے قتال'' کے ہیں، قرآن کریم اور احادیث نبویہ دونوں میں یہ لفظ اسی معنی و مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔(۱۲)

علماء کے ہاں ''غزوہ'' اور سریہ میں یہ فرق کیا جاتا ہے کہ ''غزوہ'' اس جنگ کو کہا جاتا ہے، جس میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت کی ہو اور ''سریہ'' اسے کہتے ہیں کہ جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی کو امیر بنا کر ارسال کیا ہو۔

''غزوہ'' کے بنیادی مفہوم میں بھی (دشمن کی طرف) چلنا اور حرکت کرنا شامل ہے، گویا نبی اکرمؐ کی سیرت و سوانح کو چاہے ''سیرۃ'' کا نام دیا جائے یا مغازی کا دونوں میں دنیا کے لیے حرکت کرنے چلنے اور دوسروں کو چلانے یعنی خود عمل کرنے اور دوسروں کو عمل پر متوجہ کرنے کا مفہوم شامل ہے یوں اللہ تعالیٰ نے روز ازل سے یہ عنوانات اپنے آخری نبیؐ کے کردار و عمل اور اخلاق و سیرت کے لیے مخصوص فرما دیئے تھے یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں کبھی بھی ان الفاظ کا استعمال سابق انبیاء علیہم السلام کے کردار و عمل کے لیے نہیں ہوا تھا اور ان کا استعمال پہلی مرتبہ ذات رسالت مآبؐ کے لیے ہی ہوا اور پھر ضمنی مفہوم کے تحت دوسروں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔

۳۔ پہلی صدی ہجری میں سیرت نگاری کا منہج: آنحضورؐ کے زمانۂ مبارکہ میں ''قرآن کریم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث'' تمام علوم و فنون کا مرجع تصور ہوتے تھے لیکن نبی اکرمؐ کے بعد عہد صحابہ و تابعین میں جب نئی فتوحات شروع ہوئیں اور اس کے نتیجے میں بہت سے غیر مسلم افراد اسلام قبول کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور علوم میں وسعت کا سلسلہ شروع ہوا تو اس دور میں آنحضورؐ کی سوانح عمری اور حالات زندگی کو مدون کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی

تو اس نئے علم کو ''علم السیر ۃ'' یا علم المغازی والسیر کا نام دیا گیا۔

۴۔**لفظ سیرۃ کا ابتدائی دنوں میں استعمال:** اوپر گزر چکا ہے کہ ابتدائی دنوں میں نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ کے لیے کوئی الگ عنوان نہیں تھا، لیکن آپؐ کے حالات زندگی اور آپ کی سیرۃ طیبہ کو ''علم الحدیث'' ہی کے تحت بیان کیا جاتا تھا۔

دوسری طرف لفظ ''سیرت'' کا ابتدائی استعمال کردار اور اخلاق کے مفہوم میں ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک حدیث نبوی میں ہے:

اللھم حَسِّن سیرتی کما حسنت صورتی ۔(۱۳)	اے اللہ جس طرح تو نے میری صورت عمدہ بنائی ہے اسی طرح میرے سیرت واخلاق کو بھی عمدہ بنا دے۔

اسی مفہوم میں ہمیں...... اس لفظ کا استعمال حضرت...... علی بن ابیؓ طالب کے ایک خطبے میں ملتا ہے، چنانچہ...... مسند احمد بن حنبل میں ہے:

قام علی رضی اللہ عنہ علی المنبر فذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وَاستُخلف ابوبکر رضی اللہ عنہ فعمل بعملہ وَسَارَ بسیرتہ حتی قبضہ اللہ عزوجل علٰی ذالک ثم استخلف عمر رضی اللہ عنہ علٰی ذالک فعمل بعملھا وسار بسیرتھا حتی قبض اللہ علٰی ذالک(۱۴)	حضرت علی کرم اللہ وجہہ (خطبہ دینے کے لیے) اٹھے، تو انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا اور پھر فرمایا: رسول اللہؐ کا وصال ہو گیا اور ان کی جگہ (حضرت) ابوبکرؓ خلیفہ بنا دیئے گئے، تو انہوں نے نبی اکرمؐ کے عمل اور سیرت کے مطابق عمل کیا، یہاں تک کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا، پھر حضرت عمرؓ ان کے جانشین بنے تو انہوں نے ان دونوں کے طرز عمل اور سیرت کے مطابق عمل کیا، تا آنکہ ان کی وفات ہو گئی۔

اس روایت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نبی اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ دونوں کے طریقۂ ومنھاج عمل کے لیے لفظ ''سیرت'' استعمال کیا ہے اور یہ وہی مفہوم ہے جس میں دوسری صدی کے نصف آخر کے بعد اس لفظ کا استعمال شروع ہوا۔(۱۵)

اسی طرح جب صحابہ کرامؓ نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں پر بیعت کی، تو اس وقت جو الفاظ ادا کیے جاتے تھے وہ یہ تھے:

ابایعک علیٰ...... و سنة رسوله و سیرة ابی بکر و عمر ...... (۱۶) میں آپ کی فلاں فلاں بات پر اور اس کے رسول اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے طریقے (سیرت) کے مطابق آپ کی بیعت کرتا ہوں۔

اسی طرح......مسند الدارمی کے مقدمہ میں ہے:

فما رأیت قومًا اَیْسَر سیرة منهم...... (۱۷) میں نے ان سے زیادہ آسان سیرت و کردار والا، یعنی چال چلن والا کوئی شخص نہیں دیکھا

۵۔ مغازی اور اس کا دائرہ کار: اس طرح اسلامی تاریخ کے ابتدائی دنوں میں لفظ سیرت کا استعمال نبی اکرمؐ سمیت مختلف لوگوں کے حالات و کوائف اور ان کے طریقوں اور رویوں پر ہوتا تھا، البتہ اس کے لیے لفظ (یہ لفظ مخصوص نہ تھا تاہم جلد ہی) ''سیرت'' کی جگہ آنحضورؐ کے حالات زندگی کے لیے لفظ مغازی استعمال ہونے لگا۔

اس عنوان کی مقبولیت کی بنیادی وجہ غالبًا وہ مخصوص حالات بھی تھے، جو نبی اکرمؐ کے وصال کے فوری بعد جزیرہ نمائے عرب میں پیدا ہوئے اور مسلمانوں کو بیک وقت کئی محاذوں پر طویل المیعاد ایسی جنگیں لڑنا پڑیں، جو برسوں جاری رہیں اور وقتاً فوقتاً از سر نو شروع اور پیدا ہوتی رہیں۔ ان حالات میں سیرت نبوی کا جو حصہ سب سے پہلے صحابہ اور تابعین کی توجہ کا باعث بنا، وہ نبی اکرمؐ کی مغازی کا بابرکت سلسلہ تھا، اس طرح، یہ مطالعہ ایک طرف تو مسلمانوں کو نبی اکرمؐ کی مشرف ذات اور آپؐ کی سیرت سے وابستگی کا شرف عطا کرتا تھا اور دوسری طرف یہ اسلام کے نظام حرب (حربیات Wars) کے مطالعے اور ان سے استفادے کا باعث بھی تھا۔

یوں مغازی کا موضوع اس زمانے میں ہونے والی جنگوں کی حکمت عملی اور ان کے انداز اور منہج کو بیان کرنے کے لیے عوام و خواص کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

قدیم عرب کی ادبی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ عرب بنیادی طور پر بہادر لوگ تھے اور یہ لوگ مختلف قبائل کی صورت میں زندگی گزارتے تھے اور انہیں اکثر لڑائیوں اور

جنگوں سے سابقہ رہتا تھا، اسی لیے انہیں اپنی گزشتہ تاریخ میں صرف ایسے لوگ ہی پسند تھے، جنھوں نے اپنے اپنے زمانے میں بے شمار فتوحات حاصل کی تھیں، ایسے لوگ ہی اسلام سے پہلے عربوں کے ابطال تھے اور اہل عرب ان کے جنگی کارنامے اپنی عوامی مجالس میں سنتے تھے اور اس پر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ اسلام کی آمد کے بعد اگرچہ پرانے تصورات بدل گئے تھے اور قدیم زمانے کے ہیرو اب ان کے ہیرو نہ تھے، لیکن اپنی فطرت کے تحت انہوں نے ان کی جگہ نبی اکرمؐ کی مغازی کو لے لیا اور یہ واقعات سنے اور سنائے جانے لگے اور انہوں نے جلد ہی ''عوام میں مقبول'' کہانیوں کا درجہ حاصل کرلیا، اس کے لیے اس دور کے معتبر اور ثقہ لوگوں کو میدان عمل میں آنا پڑا اور ''مغازی رسول'' کی اصلی اور سچی کہانیاں لوگوں کو بتانا پڑیں۔ (۱۸)

اس دور میں جو حضرات مغازی نگاری میں زیادہ معروف ہوے، ان میں حضرت عبداللہؓ بن عباس بھی تھے، چنانچہ ان کے ایک شاگرد عبداللہ بن عتبہ ان کے متعلق نقل کرتے ہیں:

ولقد كان يجلس يوماً لايذكر	حضرت عبداللہ بن عباس کسی روز صرف فقہ پر،
الاالفقه ويوماً التاويل ويوماً	کسی روز تفسیر قرآن پر، کسی دن سیرت و
المغازى ويوماً الشعر ويوماً ايام	مغازی پر، کسی دن شعر و شاعری پر اور کسی دن
العرب ...... (۱۹)	قدیم عربوں کے حالات پر گفتگو فرماتے تھے۔

اسی طرح انہیں حضرت عبداللہؓ بن عباس کے متعلق ان کے ایک اور شاگرد بتاتے ہیں:

''ہم ان کی خدمت میں آتے، تو شام کے پورے وقت میں ہمارے سامنے مغازی بیان کرتے، انہوں نے اس بارے میں جو کچھ لکھا وہ اتنا تھا کہ ایک اونٹ کا بوجھ ہو سکتا تھا۔ (۲۰)

اسی بنا پر ابتدائی دو صدیوں میں ''سیرت طیبہ'' پر مدون ہونے والا سرمایہ اسی عنوان کے تحت مرتب کیا گیا، تاہم جلد ہی ایک اور تبدیلی آئی اور دوسری صدی ہجری میں ''مغازی'' کے ساتھ ساتھ ''سیرۃ'' کا لفظ بھی اسی معنی و مفہوم میں استعمال ہونے لگا، جس کا ابتدائی ثبوت ہمیں ''محمد بن اسحاق'' کی کتاب کے نام میں ملتا ہے، جو اس طرح تھا:

کتاب السیرۃ والمبتدا والمغازی۔ (۲۱)

یہاں انہوں نے کتاب کے نام میں ''سیرۃ'' اور مغازی دونوں الفاظ کو جمع کیا ہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں ''المغازی'' کا نام ''سیرۃ'' طیبہ کے لیے زیادہ معروف تھا، جیسا حضرت عروہ بن زبیر (۹۴ھ)، الواقدی، (م ۲۰۷ھ/۸۲۲ء)، معمر بن راشد (۱۵۴ھ)، اور ابوالحسن علی بن محمد المدائنی (۲۳۵ھ)، اور موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱ھ) کے ہاں ملتا ہے، تاہم اس دور میں سیرۃ کا لفظ بھی نبی اکرمؐ اور دوسرے لوگوں کے حالات وسوانح دونوں کے لیے مستعمل تھا۔(۲۲)

پھر جب عبدالملک بن ھشام، المعروف بہ ابن ھشام (م ۲۱۳ھ) نے محمد بن اسحاق کی السیرۃ کو تہذیب و تلخیص کے ساتھ طبع کیا اور اس کا نام ''السیرۃ النبویہ'' رکھا تو اس کے بعد رفتہ رفتہ نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کے لیے المغازی کا نام متروک ہو گیا اور ''سیرۃ'' کا عنوان اس مقصد کے لیے وسیع پیمانے پر اختیار کر لیا گیا، چنانچہ اس کے بعد کتابوں کے ناموں میں ہمیں یہ تبدیلی واضح طور پر نظر آتی ہے، یہ استحکام تیسری اور چوتھی صدی میں جا کر پیدا ہوا۔ چنانچہ چوتھی صدی ہجری میں اس نوع کی ہمیں کئی کتابیں ملتی ہیں، جن میں یہ تبدیلی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

بطور مثال ابوالحسن احمد بن فارس بن زکریا اللغوی (م ۳۹۵ھ) کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جن کی کتاب ''مختصر سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم یا اوجز سیر خیر البشر ہے'' جو بمبئی اور انقرہ وغیرہ سے طبع ہو چکی ہے۔ اس طرح ''مغازی وسیرت نگاری'' کا فن بنیادی طور پر ''علم الحدیث'' ہی سے پیدا ہوا اور عمومی لحاظ سے اسے اسی کی ایک شاخ اور فرع قرار دے سکتے ہیں (۲۳)، تاہم حدیث اور سیرت میں بقول ڈاکٹر محمد حمید اللہ بنیادی فرق یہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ کا ایک مربوط واقعے کے طور پر تذکرہ نہیں ہے، جبکہ سیرت و مغازی میں حیات طیبہ کے مختلف واقعات کا بطور ایک واقعے کے ذکر ہوتا ہے، اس کی مزید تفصیل اس طرح ہے کہ ایک محدث کے نزدیک اصل اہمیت روایت یعنی سند اور اس کے متن کی ہے اور اگر ایک ہی متن ایک سے زیادہ سندوں کے ساتھ روایت کیا گیا ہو تو، محدث کے نزدیک یہ الگ الگ روایت تصور ہوگی۔ اسے اس بات سے غرض نہیں ہے کہ ان روایات میں مذکور، واقعہ مکمل ہوتا ہے۔ یا

نہیں، جبکہ ایک سیرت نگار کے نزدیک کسی بھی واقعے یا اس کی جزئیات کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اس کے نزدیک کسی بھی واقعے سے متعلق روایات کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا جاتا ہے، تاکہ پڑھنے والے کو تمام باتیں یکجا مل سکیں، اس لیے ہر محدث کو سیرت نگار اور ہر سیرت نگار کو محدث قرار نہیں دیا جاسکتا۔(۲۴)

۶۔سیرت و مغازی کی ابتدائی نشو ونما: تاریخ کا ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ اسلام سے قبل عربوں کے ہاں تصنیف و تالیف کی کوئی مستحکم روایت موجود نہ تھی، اور اپنے بزرگوں یا قدیم تاریخ کے متعلق صرف چند روایات کا ذخیرہ تھا، جو ان کے بڑے بزرگ روایت کرتے تھے، اس طرح ان کے پاس جو بھی تاریخی یا فکری سرمایہ تھا، وہ محض چند روایات تک محدود تھا، حتیٰ کہ مکہ مکرمہ میں لکھنے لکھانے کا فن نبی اکرمؐ کی ولادت باسعادت سے چند برس پہلے پہنچا تھا اور جب اسلام آیا اس وقت ''مکہ مکرمہ'' میں کل سترہ لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

پھر جب قرآن کریم کا نزول ہوا، تو یہ تمام مسلمانوں کا مرجع عقیدت و عمل قرار پایا اور یہ پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے کی تمام سرگرمیوں کا مرکز بن گیا، دوسری طرف نبی اکرمؐ کی احادیث مبارکہ کا سرمایہ زیادہ تر زبانی نقل و روایت کے ذریعے اگلی نسل تک منتقل ہوتا رہا۔

تاہم جلد ہی یہ احساس پیدا ہوا کہ عربوں کی قدیم تاریخ کو مدون کرنا چاہیے، چنانچہ امیر معاویہ (۴۰۔۶۰ھ) نے عبید بن شریہ الجرھمی کو صنعاء سے بلوایا۔جنہوں نے ان کے لیے ''کتاب الملوک'' و''اخبار الماضیین'' (۲۵) تصنیف کی۔

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان علماء نے حضرت امیر معاویہؓ کی طرف سے قدیم تاریخ کو اسلام سے الگ کر کے مدون کرنے کی یہ کوشش پسند نہیں کی، اس کی جگہ انہوں نے نبی اکرمؐ کے حالات زندگی مرتب اور مدون کرنے کو ترجیح دی اور قدیم تاریخ کو اس کے تابع کر کے پیش کیا، اس دور میں احادیث کی تدوین ابھی شروع ہوئی ہی تھی، اسی لیے بہت سے علماء نے قدیم تاریخ نگاری کی جگہ ''سیرت نگاری'' شروع کر دی۔

۷۔ابتدائی سیرت نگار اور ان کی مشکلات: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات طیبہ میں آپؐ نمازوں میں امامت کرواتے، غزوات اور مہمات میں لشکروں کی قیادت فرماتے، جمعہ

اور دوسرے مواقع پر خطبات ارشاد فرماتے، اس لیے صحابہ کرامؓ کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپؐ کی سوانح عمری مرتب کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، جسے آپؐ کے بارے میں جاننا ہوتا وہ آفتاب نبوت کو خود آ کر جلوہ آرا دیکھ لیتا۔ آپؐ کی گفتگو سن لیتا تو اس کی تسلی ہو جاتی۔

لیکن جب ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ/۶۳۲ء کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا سانحہ پیش آیا تو صحابہ کرامؓ اور اس وقت موجود مسلمانوں کے لیے دنیا تبدیل ہو گئی اور نوزائیدہ اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاست کو ایسا دھچکا لگا کہ مدتوں اس کے اثرات دکھائی دیتے اور محسوس کیے جاتے رہے، جس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ ابھی صحابہ کرامؓ ذہنی طور پر اس حادثے کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے جلد ہی ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ امت مسلمہ کو اپنی تمام توجہ ان مسائل سے نمٹنے پر مبذول کرنا پڑی، جن میں سب سے اہم آپؐ کے وصال کے ردعمل کی بنا پر جنم لینے والی ارتداد (ردّہ) کی تحریک تھی، جس نے جزیرہ عرب کو ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے تک ہلا کر رکھ دیا تھا اور ارتداد کی تحریک پر قابو پانے کے دوران میں صحابہ کرام کو علم ہوا کہ اس کے ڈانڈے تو سرحد پار روم و فارس کی حکومتوں کے ساتھ ملتے ہیں، اسی لیے ارتداد کی تحریک سے نبرد آزمائی کے بعد اصل دشمنوں یعنی روم اور فارس سے جنگ شروع ہو گئی، یہ جنگ ابھی جاری ہی تھی کہ خلافت کے مسئلے نے مسلمانوں کو داخلی محاذ پر مصروف کر دیا اور باہمی خانہ جنگی نے بہت سا وقت اور بہت سی جانیں تلف کر دیں۔ (۲۶)

اموی دور حکومت (۴۰-۱۳۲ھ) کے دوران میں اسلامی حکومت میں قدرے استحکام آیا اور مسلمانوں کو علمی اور فکری مسائل کی طرف توجہ دینے کا موقع ملا، تو اگرچہ بہت سا وقت نکل چکا تھا، لیکن پھر بھی ریاستیں اور ملک فتح کرنے والے ذہنوں نے علمی اور فکری ریاستیں فتح کرنے میں بھی زیادہ وقت نہیں لیا اور بہت جلد علمی اور فکری دنیا مین اپنا لوہا منوانے میں اپنی بہترین فکری صلاحتیں صرف کر دیں اور اسلام کی فکری تحریک کو وہ مضبوط بنیادیں فراہم کیں کہ جن پر مستقبل میں بڑی بڑی فکری اور علمی تحریکات مرتب اور مدون ہو کر سامنے آسکیں۔

دنیا میں اسلام کی اشاعت جس تیزی کے ساتھ ہوئی اس کی پوری انسانی تاریخ میں

کوئی اور مثال موجود تھیں اور اب تک اسلام دشمن قوتیں۔اس کی غلط تعبیرات بیان کر کے اپنے آپ کو تسلی دینے میں مصروف ہیں۔

پھر اسلام کی اشاعت کو تقویت پہنچانے کے لیے جس فکری ادب کی ضرورت تھی وہ عالم اسلام کی جنگوں اور داخلی فتنوں میں مشغولیت کے باعث مرتب نہیں کیا جا سکا تھا تاہم وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت بڑھ رہی تھی،اس ''فکری ادب'' میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم احادیث مبارکہ اور ''سیرت طیبہ'' کی تدوین سرفہرست تھی۔

۸۔علم الحدیث کے سائے میں علم السیرۃ کی ابتدائی نشونما: اسی لیے اس امر پر حیران ہونے والی کوئی بات نہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ''سیرت طیبہ'' کی ابتدائی نشو ونما علم الحدیث کے زیر سایہ ہوئی اور کم از کم دو صدیوں تک تمام بڑے بڑے سیرت نگار وہی تھے،جو اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث تھے،اس کی وجہ یہ تھی کہ ''علم الحدیث'' کا موضوع بھی وہی ہے،جو علم السیرۃ کا ہے،یعنی نبی اکرمؐ کے اقوال،افعال اور تقریرات کی تدوین البتہ جیسا کہ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں،محدثین کے ہاں روایت یعنی سند اور اس کے متن کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اور سیرت نگاروں کے ہاں واقعات اور ان کی ترتیب کو،لہٰذا علم السیر ۃ کو علم الحدیث سے الگ ہونے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا اور دونوں نے ایک دوسرے سے الگ ہونے کا مرحلہ بہت جلد مکمل کر لیا۔

بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ اس دور کے بڑے بڑے محدثین اور روایت نگاروں نے ہی پہلے پہل علم السیرۃ کی تدوین کی اور اس کا ابتدائی دور انہی کے ہاتھوں مکمل ہوا۔

۹۔نامور صحابہ کرامؓ کی سیرت نگاری: کتب تاریخ وسیرت سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضورؐ کے ابتدائی سیرت ومغازی نگار صحابہ کرامؓ تھے اور تمام نامور صحابہ کرامؓ نے آنحضورؐ کو جس حالت اور جس کیفیت میں دیکھا اور آپؐ کے جس واقعے کو دیکھا،اسے انہوں نے اسی طرح روایت کیا اور اسی طرح سے دوسروں کو بتایا اس طرح دنیا میں سیرت نگاری کی ابتدا ہوئی۔

نبی اکرمؐ کے ابتدائی دور میں ''سیرت ومغازی'' بیان کرنے والے صحابہ کرام میں تمام اکابر واصاغر صحابہ کرام شامل ہیں،اس فہرست میں خلفاے راشدینؓ،حضرت عبداللہؓ بن مسعود (م۳۲ھ)،حضرت عبداللہؓ بن العاص/حضرت عبداللہ بن عمرؓ (م۷۳ھ)،حضرت عبداللہ بن

عباسؓ (م ۶۸ ھ)، حضرت ابو ہریرہؓ (۵۸ ھ)، حضرت عائشہؓ (م ۵۸ ھ)، حضرت ام حبیبہؓ اور حضرت عبادہؓ بن الصامت جیسے نامور اور بزرگ صحابہ کرام شامل ہیں۔

ان میں سے چند صحابہ کرام کی اس حوالے سے شہرت دوسروں سے زیادہ ہے، مثال کے طور پر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ذات اس حوالے سے بنیادی مصدر فیض تصور ہوتی ہے اور نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ اور آپ کی شمائل مبارکہ اور آپ کے اقوال حکیمانہ کی صحت کے لیے ان سے ہی رجوع کیا جاتا تھا، اسی بنا پر جدید تحقیقات کی رُو سے اولین مغازی و سیرت نگار حضرت عروہ نہ صرف یہ کہ ان کے بھانجے تھے، بلکہ ان کے سب سے زیادہ قابل اعتماد شاگرد بھی تھے (۲۷) اور ان کی روایات کا سب سے بڑا ماخذ حضرت عائشہؓ ہی کی ذات مبارکہ ہے۔

اسی طرح خلفائے راشدین میں سے حضرت علیؓ کو نبی اکرمؐ سے قریبی اور طویل رفاقت کا شرف حاصل ہے اور پھر انہیں دوسرے خلفا کے مقابلے میں دوسروں کے سامنے آنحضورؐ کی سیرت طیبہ کو بیان کرنے کا زیادہ موقع ملا، اسی لیے نبی اکرمؐ کے حلیہ مبارکہ سے حالات وشمائل تک کے ضمن میں ان کی ذات مرجع عوام وخواص رہی اور مدینہ منورہ اور عراق (کوفہ و بصرہ) مکتب فکر کے مرکزی سیرت نگار انہی سے زیادہ تر مستفید ہوئے۔(۲۸)

علیٰ ھذا القیاس حضرت عبداللہ بن عباسؓ (۶۸ ھ)، کی ذات بھی ایسے بزرگوں اور ایسے محدث صحابہ کرامؓ میں شامل تھی، جنہیں نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ پر عبور حاصل تھا اور وہ مکہ مکرمہ میں درس قرآن وحدیث کے علاوہ درس مغازی بھی دیا کرتے تھے (۲۹) اور ان کے پاس مغازی سے متعلقہ روایات کا ایک اونٹ کے وزن کے برابر ذخیرہ موجود تھا، (**وکان عندہ حمل بعیر**) اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کی سیرت ومغازی سے متعلق یادداشتیں اتنی زیادہ تھیں، جنہیں اونٹ پر لاد کر ہی ادھر اُدھر لے جایا جا سکتا تھا۔(۳۰)

اسی طرح حضرت ''براءؓ بن عازب'' کے متعلق بھی یہ تحریر کیا گیا ہے کہ انہوں نے سیرت ومغازی سے متعلق تحریری یادداشتیں تیار کی تھیں، جنہیں وہ اپنے شاگردوں کے سامنے بیان کیا کرتے تھے، چنانچہ کتب ستہ میں ان سے یہ روایات کثرت سے مروی ہیں۔(۳۱)

۳۔ باقاعدہ تصنیف وتالیف کا دور: تاہم بہت جلد اسلامی دنیا میں ایسی تبدیلیاں رونما

ہوئیں، جنہوں نے وسیع پیمانے پر دنیا کو متاثر کیا۔

ان واضح اور دوررس تبدیلیوں میں سب سے واضح تبدیلی "تدوین علوم" کی صورت میں نظر آتی ہے، جس کی ابتدا عمر ثانی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (۹۹۔۱۰۱ء) کے احکام کے تحت، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ بشمول سیرت و مغازی کی جمع و تدوین کی صورت میں ہوئی اور انہوں نے مدینہ منورہ کے گورنر حضرت ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ:

انظر کان من حدیث رسول الله	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آپ کو جو احادیث
صلی الله علیه وسلم فاکتبه فانی	ملیں، انہیں لکھ لو، اس لیے کہ مجھے علم کے مٹنے
خفت دروس العلم و ذهاب	اور علماء کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے اور نبی اکرم
العلماء ولا تقبل الا حدیث النبی	صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے سوا کچھ اور
صلی الله علیه وسلم ۔(۳۲)	قبول نہ کرو۔

یہ خط اس تحریک کا نقطۂ آغاز تھا، جس کے تحت احادیث نبویہ سمیت تمام علوم وفنون کی تصنیف و تدوین کا آغاز ہوا اور اگلی صدی میں بہت سی بنیادی کتب مرتب اور مدون کی گئیں جن کے اثرات صدیاں گزرنے کے باوجود اب تک موجود ہیں۔

(۲)۔عہد تابعین کا اولین تحریری سرمایہ: صحابہ کرامؓ کی نگرانی اور ان کی قیادت میں ایک طرف تو قرآن کریم اور اس کے علوم وفنون کی تدوین کا عمل جاری تھا، دوسری طرف علم السیرۃ و المغازی پر بھی داد تحقیق دی جارہی تھی۔ اس سلسلے میں اولیت کا شرف جن بزرگوں کو حاصل ہوا ان میں حضرت ابان بن عثمانؓ کا نام سرفہرست ہے۔

ا۔ابان بن عثمانؒ: حضرت ابان بن عثمان کا شمار عہد تابعین کے بلند پایہ علماء میں سے ہوتا ہے۔ ان کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے سیرت نگاری پر تحریری سرمائے کی ابتدا کی۔ ان کے مختصر کوائف درج ذیل ہیں۔

ا۔ولادت اور حصول علم: حضرت ابان بنؒ عثمان نبی اکرمؐ کے دوہرے داماد اور خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ بن عفان کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی اور حضرت عمروؓ بن عثمان کی والدہ ام عمرو بنت جندب ہیں۔(۳۳)۔ان کی ولادت ۲۰ھ میں ہوئی؟ (۳۳الف) اور چونکہ یہ بات مسلم

ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت ۱۸/ذوالحجہ ۳۵ھ میں ہوئی اور چونکہ انہوں نے اپنے والد محترم سے چند روایات بھی نقل کی ہیں، لہٰذا اگر وہ اپنے والد کی وفات کے وقت ۱۵ برس کے تھے اور یہ دور مدینہ منورہ کی علمی تاریخ میں سنہری دور تصور ہوتا ہے۔

یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ جب انہوں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اس وقت مدینہ منورہ میں متعدد صحابہء کرامؓ درس وتدریس میں مصروف تھے (۳۴)، چنانچہ حضرت ابانؓ نے بھی اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور متعدد صحابہ کرامؓ سے، جن میں خاص طور پر ان کے والد محترم اور حضرت زید بنؓ ثابت کا نام سرفہرست طور پر شامل ہے، (۳۵) سے استفادہ کیا۔

ان کے والد محترم کی شہادت کے بعد حالات جس طرح تیزی سے تبدیل ہوئے یہ سب بھی انہوں نے اپنی نگاہوں سے دیکھا تھا، لیکن انہوں نے خود کو مکمل طور پر دنیائے علم تک محدود رکھا، اس لیے بہت جلد ان کے علم وفضل کا شہرہ دور دور تک جا پہنچا۔ (۳۶)

ان کا شمار اس دور کے دس فقہائے مدینہ میں ہوتا ہے، جن میں سرخیل تابعین حضرت سعید بن المسیبؒ جیسے افراد بھی شامل تھے (۳۷)۔ اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علم وفضل کا عظیم سمندر تھے۔ وہ سات برس تک مدینہ منورہ کے گورنر بھی رہے۔ نامور اموی حکمران عبدالملک بن مروان ان کا خاص احترام کرتا تھا اور وہ بھی ان کے پاس کثرت سے آمد ورفت رکھتے تھے۔ آخری عمر میں ان پر فالج کا حملہ ہوا، جس سے ان کی سماعت اور ان کی قوت گویائی کافی متاثر ہوئی۔

ان کا انتقال ۱۰۵ھ/میں ہوا اور وہ مدینہ طیبہ میں دفن کیے گیے۔ (۳۸) یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے عبدالملک بن مروان (م۸۶ھ) سے قبل انتقال کیا۔ (۳۹)

۲۔ حضرت ابانؒ کی خدمات حدیث وسیرت: حضرت ابانؒ کا شمار ان بزرگ تابعین میں ہوتا ہے جن کے علم وفضل کا بہت کم حصہ آگے منتقل ہو سکا ہے۔ ان سے مروی احادیث کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ جن میں آنحضورؐ کی وہ حدیث مبارکہ بھی شامل ہے جو وہ اپنے والد حضرت عثمانؓ کے واسطہ سے آنحضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص یہ دعا صبح وشام پڑھ لے اُسے زمین اور آسمان کی کوئی چیز بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی، وہ دعا یہ ہے۔

اعوذ بکلمات الله التامآت کلها من	میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کے تمام پاکیزہ کلمات
شر ما خلق بسم الله الذی لایضر مع	کے ساتھ ہر اُس شے کے شر سے جو اُس نے
اســـمـــه شـی فـی الارض ولا فـی	پیدا کی ۔ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو
السماء وهو السمیع العلیم (۴۰)	بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے

حضرت ابانؒ اپنے زمانے کے بہت بڑے فقیہ اور محدث تھے ۔ پھر کیا انہوں نے اپنی روایات اگلی نسل کو منتقل نہیں کیں یا ان کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ پیش آ گیا کہ جس نے ان کی تمام روایات کا ذخیرہ تلف کر دیا اور وہ اگلی نسل تک منتقل نہ ہوسکا؟ مختلف کتابوں اور کتب تذکرہ کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دوسری بات ہی صحیح ہے ۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے ، مقدمہ سیرت ابن اسحاق میں معروف مستشرق وسٹنفلٹ (wustenfildt) کی ابتدائی مؤرخین کی فہرست نقل کی ہے ، جس میں درج ذیل لوگوں کے نام شامل ہیں لکھتے ہیں :

۱ ۔ حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ۔ ۲ ۔ زیاد بن ابی سفیان ۔ ۳ ۔ مخرمہ بن نوفل رضی اللہ عنہ ۔ ۴ ۔ دغفل بن حنظلہ الذھلی السدوسی ۔ ۵ ۔ عبید بن شریہ الجرھمی ۔ ۶ ۔ ابوکلاب ، وقاع لسان الحمرہ ۔ ۷ ۔ الحطیف بن زید بن جعونہ ۔ ۸ ۔ زید بن کیاس النمری ۔ ۹ ۔ ابن الکوا الیشکری ۔ ۱۰ ۔ یزید بن بکر بن داب اور اس کے بیٹے عیسیٰ اور یحییٰ ۔ ۱۱ ۔ علاقہ بن کریم الکلابی ۔ ۱۲ ۔ صحار بن عیاش (یا عباس) الکلابی ۔ ۱۳ ۔ عروہ بن الزبیر ۔ (م ۹۳ھ) ۱۴ ۔ صالح بن عمران الصغدی ۔ ۱۵ ۔ عامر الشعبی ۔ ۱۶ ۔ وھب بن منبّہ (م ۱۱۰ یا ۱۱۴ھ) ۔ ۱۷ ۔ قتادہ بن دعامہ السدوسی ۔ ۱۸ ۔ ابن شھاب الزھری (م ۱۲۱ھ) ۔ ۱۹ ۔ ابومخنف لوط ۔ ۲۰ ۔ شبیل بن عروہ (عزرہ) الضبعی ۔ ۲۱ ۔ موسیٰ بن عقبہ ۔ ۲۲ ۔ ابوعمیر مجالد بن سعید الہمدانی ۔ ۲۳ ۔ شرقی بن قطامی ۔ ۲۴ ۔ طریف بن طارق المدنی ۔ ۲۵ ۔ عبداللہ بن عباس بن ابی ربیعہ ۔ ۲۶ ۔ محمد بن السائب الکلبی ۔ ۲۷ ۔ عوانہ بن الحکم ۔ (۴۱)

اس موقع پر ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے ان میں سے کچھ لوگوں کے مختصر حالات زندگی اور کوائف بھی دیئے ہیں ، جن کو سامنے رکھنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں سے زیادہ تر لوگوں کا تعلق علم الانساب یا علم التاریخ سے تھا ، اسی لیے ان کی اکثریت کو مؤرخ تو قرار دیا جاسکتا ہے ، مگر

سیرت ومغازی نگار قرار نہیں دیا جاسکتا، اس نسبت سے سیرت نگاروں کی فہرست کے طور پر انہیں نقل کرنا تسامح ہے۔ بہرحال اس فہرست میں سے محض سیرت نگاروں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔عروہ بن زبیرؒ (۹۳ھ)، (معروف تابعی بزرگ) ۔۲۔ وھب بن منبہؒ (م ۱۱۰ھ یا ۱۱۴ھ)، ایک یہودی عالم جو بعدازاں مسلمان ہوگئے تھے۔۳۔محمد بن شھاب الزھریؒ (م ۵۲۔ ۱۲۱ھ)، معروف تابعی بزرگ اور محدث وسیرت نگار۔۴۔محمد بن اسحاقؒ معروف، مغازی وسیرت نگار (م ۱۵۱ھ)۔ جبکہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے مطابق وسٹفلٹ نے درج ذیل سیرت نگاروں کا ذکر نہیں کیا۔۵۔ابان بن عثمان بن عفانؒ (م ۱۰۳ھ)۔۶۔ یزید بن ابی حبیبؒ (م ۱۲۰ھ)۔۷۔معمر بن راشد (م ۱۵۳ھ)۔(۴۲)

ان میں سب سے اہم نام حضرت ابان بن عثمانؓ کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں:

ابـان بـن عثمان بن عفان صاحب المـغـازی لـه كتـاب جمع فيـه المـبـدا والـمـبـعـث والـمـغـازی والـوفات والسقيفه والرده توفی سنه ۱۰۵ ۔(۴۳)	حضرت ابان بن عثمان بن عفان نبی اکرمؐ کی مغازی پر کتاب کے مولف ہیں، جس میں انہوں نے دنیا کی ابتدا، بعثت اور نبی اکرمؐ کی مغازی، آپ کی وفات، سقیفہ بنی ساعدہ اور ارتداد کو جمع کردیا ہے۔

اسی طرح معروف مورخ احمد امین ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نبی کریمؐ کی زندگی، اور آپ کے غزوات کے متعلق ایک رسالہ میں بہت سی روایات (اخبار) جمع کررکھی تھیں لیکن بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ حضرت ابانؒ نے سیرت پر جو مواد جمع کیا تھا وہ محض چند صفحات تھے جن میں نبی اکرمؐ کی احادیث تھیں''۔(۴۳)

عصر حاضر کی سیرت طیبہ کے ماخذ پر مرتبہ ایک اور کتاب میں ان کے اس مجموعے کے بارے میں یہ بھی صراحت ہے کہ ان کی اس کتاب کو ان کے ایک شاگرد عبدالرحمان بن المغیرہ نے ان احادیث کو جن کا تعلق نبی اکرمؐ کی زندگی کے ساتھ تھا ایک مستقل مجموعے میں جمع کردیا تھا۔(۴۴)

حضرت ابان کے متعلق سب سے بڑی شہادت وہ ہے جسے الزبیر بن بکار نے اپنی معروف زمانہ کتاب الموفقیات میں پیش کیا ہے وہ یہ کہ مغیرہ بن عبدالرحمان کے پاس ان کی مغازی کا ایک تحریری نسخہ موجود تھا، لیکن ان کی روایات کتب سیرت ومغازی میں جگہ نہیں پا سکیں، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان کے اس ذخیرہ علمی کو اموی حکمرانوں نے سیاسی مصالح کی بنا پر جلا کر راکھ کر دیا تھا، چنانچہ ان کی مغازی کے سلسلے میں حضرت زبیرؒ بن بکار کی روایت میں ہے۔

''زبیرؒ بن بکار (۱۷۲-۲۵۶ھ) کہتے ہیں کہ انہیں عبدالرحمان بن یزید نے بتایا کہ ہمارے پاس سلیمان بن عبدالملک ۸۲ھ میں حج کرنے کے لیے آیا، اس وقت وہ ولی عہد تھا، وہ مدینہ منورہ بھی آیا لوگ اس کے پاس آئے اور اسے سلام کیا اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مقامات کو دیکھنے گیا، جہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی اور جہاں غزوۂ احد کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام زخمی ہوے تھے۔ اس وقت ابانؓ بن عثمان، عمرو بن عثمان، ابوبکر بن عبداللہ بن ابی احمد اس کے ہمراہ تھے، یہ لوگ اسے مسجد قبا اور مسجد فضیح، مشربہ ام ابراہیم اور احد وغیرہ کے مقامات پر لے گئے، سلیمان ان میں سے ہر ایک کے متعلق پوچھتا تھا اور وہ اسے اس کے متعلق بتاتے تھے، پھر اس نے حضرت ابانؓ بن عثمان کو کہا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ومغازی کو قلم بند کریں، ابان نے کہا کہ وہ میرے پاس پہلے ہی سے لکھی ہوئی ہے، میں نے اسے قابل اعتماد لوگوں سے روایت کیا ہے، چنانچہ انہوں نے اس کو اس (سلیمان) کے لیے نقل کرنے کا حکم دیا، چنانچہ اس نے اس مقصد کے لیے اس کے قریب لکھنے والے دس کاتب مقرر کر دیے، جنہوں نے اسے صاف شدہ کھال پر لکھنا شروع کر دیا، جب اس کا ایک نسخہ اس کے پاس لایا گیا، تو اس نے اس کو پڑھا تو اس میں انصار مدینہ کا دونوں عقبات اور غزوۂ احد میں شرکت کرنے کا ذکر تھا، اس پر وہ کہنے لگا کہ ''میرے خیال میں انہیں یہ اعزاز حاصل نہیں ہے، لہٰذا یا تو میرے گھر والوں (مراد ابان بن عثمان) نے ان کے متعلق چشم پوشی کی ہے، یا پھر وہ ایسے نہ تھے، ابان نے کہا کہ اے امیر ان لوگوں نے شہید مظلوم حضرت عثمانؓ کی رسوائی کے سلسلے

میں جو کچھ کیا وہ ہمیں حق بات کہنے سے نہیں روکتا، حق یہ ہے کہ ان کا حال ویسے ہی تھا، جیسا کہ ہم نے اپنی اس کتاب میں قلم بند کیا ہے، اس پر وہ بولا کہ پھر مجھے ایسی کتاب کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تا آنکہ میں امیر المومنین (عبدالملک) کے سامنے اس کی تفصیل نہ بیان کردوں، چنانچہ اس نے حکم دیا کہ جو کچھ لکھا گیا تھا، اسے جلا دیا جائے اور کہا کہ جب میں واپس جاؤں گا تو امیر المومنین سے پوچھوں گا اگر انہوں نے سیرت طیبہ میں یہ سب لکھنے کی اجازت دی تو اسے لکھ لیا جائے گا، اس کے بعد سلیمان بن عبدالملک وہاں سے چلا گیا اور اس نے اپنے والد عبدالملک کے سامنے ابان کی بات نقل کی تو عبدالملک بولا ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم ایسی کتاب لوگوں کے سامنے پیش کریں، جس میں ہماری فضیلت کا ذکر نہ ہو اور اہل شام کو ایسی باتیں بتائیں کہ جن کے متعلق ہم یہ چاہتے ہیں کہ انہیں اس کا علم نہیں ہونا چاہیے، سلیمان بن عبدالملک کہنے لگا اے امیر المومنین اسی لیے میں نے اس نسخے کو جلانے کا حکم دیا تھا تاکہ امیر المومنین کی رائے دریافت کرسکوں تو اس کی رائے کو درست قرار دیا گیا''۔(۴۵)

مشہور مورخ اور محقق ڈاکٹر مصطفی الاعظمی نے مندرجہ بالا اقتباس نقل کرنے کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے حضرت ابان نے سیرت طیبہ اور مغازی پر اپنی تالیف ۸۲ھ سے پہلے مکمل کر لی تھی اور یہ کہ ان کی مغازی میں ''عقبین (عقبۂ اولی، ثانیہ، ثالثہ)، احد اور بدر اور دوسرے غزوات میں انصار کی خدمات کا ذکر تھا، نیز یہ کہ یہ مغازی اتنی بڑی تھی کہ دس کاتب مل کر اس کا نسخہ تیار کرتے تھے اور سلیمان بن عبدالملک نے اس کی نقل دس رجسٹروں میں تیار کی تھی اور یہ کہ حضرت ابانؓ سمیت اموی لوگوں کا یہ خیال تھا کہ انصار مدینہ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت مدد نہیں کی تھی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے انصاف پسندی کا مظاہرہ کیا اور انصار مدینہ کے حالات زندگی پوری دیانت داری کے ساتھ مرتب کیے اور جب اموی حکمران سلیمان بن عبدالملک نے ان سے مناقشہ کیا تو انہوں نے کہا، اے امیر ہمیں یہ بات کہ انہوں نے شہید

مظلوم کو رسوا کرنے میں جو کچھ کیا اس بات سے نہیں روکتی کہ ہم حق بات کریں اور یہ لوگ واقعی ان باتوں کے مستحق تھے جو کچھ ہم نے ان کے متعلق لکھا ہے''۔(۴۶)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اس نسخے کا حال تھا جو سلیمان بن عبدالملک نے اپنے لیے لکھوایا تھا لیکن وہ دوسرا نسخہ جو حضرت ابانؒ نے اپنے لیے تیار کر رکھا تھا اس نسخے کا کیا ہوا؟

اس نسخے کے متعلق کوئی شہادت نہیں ملتی کہ اس نسخے کا کیا ہوا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے حضرت ابانؒ سے منگوا کر شہید کر دیا ہو یا حضرت ابانؒ نے اسے خود ہی ضائع کر دیا ہو، اس لیے کہ اس کا اور اس میں مندرج روایات کا کسی بھی ذخیرۂ علمی میں سراغ نہیں ملتا؟

یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے شاگرد عبدالرحمان نے جس نسخے پر کام کیا تھا وہ وہی نسخہ تھا اور اس کا ضیاع بعد کی بات ہو۔

بہر حال حضرت حفصہؓ کے پاس موجود حضرت ابوبکرؓ کے دور میں تیار شدہ مصحف صدیقی کے ساتھ ساتھ اس اہم ترین اور وقیع ترین دستاویز کا ضیاع بھی اموی حکمرانوں کے غلط کاموں میں بتایا جاتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) البخاری، کتاب کیف کان بدؤ الوحی، حدیث ۴، ص ۵ و ببعد، مطبوعہ دارالسلام (الکتب الستہ) لاہور محرم ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۰ء۔(۲) االقاموس العصری، مطبوعہ قاہرہ، ۱۹۵۰ء، ص ۳۲۸۔(۳) دیکھیے ابن منظور، لسان العرب، بذیل مادہ۔ (۴) القرآن الکریم، طٰہٰ، ۲۰/۲۷۔(۵) الزبیدی، تاج العروس، تحقیق مصطفیٰ حجازی، مطبوعہ کویت ۱۹۷۳، ۱۱۶/۱۶۔ ۱۱۷۔(بذیل مادہ س۔ی۔ر)۔(۶) یوسف، (۱۹/۱۲)۔(۷) ابن منظور، لسان العرب، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت بذیل مادہ۔(۸) دیکھیے محمد فواد عبدالباقی، معجم المفہر س لالفاظ القرآن الکریم، مطبوعہ قاہر، بامداد اشاریہ۔(۹) محمد بن اعلیٰ التھانوی، کشاف اصطلاحات الفنون، مطبوعہ بیروت، بذیل مادہ۔(۱۰) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، مقالہ سیرت، درارد ودائرہ معارف اسلامیہ، ۵/۱۱۔۵۔(۱۱) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، عجالہٰ نافعہ، بحوالہ ڈاکٹر محمود احمد غازی، محاضرات سیرت، ص ۱۹۔(۱۲) ابن منظور، لسان العرب، ۶۸/۱۰۔ بذیل مادہ غزوہ؛ نیز راغب الاصفہانی، مفردات، بذیل مادہ۔ (۱۳) احمد بن حنبل، مسند احمد بامداد، اشاریہ۔(۱۴) احمد بن حنبل، مسند احمد، ۱۲۸/۱، حدیث ۱۰۵۵ مطبوعہ، قاہرہ۔ (۱۵) اس عنوان پر مزید تفصیل ابن الندیم کی الفہر ست اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

(۱۶) مسند احمد، ۱/۱۲۸۔ (۱۷) مسند دارمی، مقدمہ، ص ۱۸۔ (۱۸) الذہبی، سیر اعلام النبلاء، ۳/۲۵؛ مطبوعہ بیروت؛ ابن سعد، طبقات، ۲/۲۔۱۲۱۔۱۲۲۔ (۱۹) ابن سعد، الطبقات، ۲/۳۶۸، دار صادر، بیروت۔ (۲۰) الذہبی، سیر اعلام النبلاء، ۳/۳۳۵۔ مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ، شارع سوریا، لبنان ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۳۔ (۲۱) ابن الندیم، الفہرست، ص ۱۰۵ مطبوعہ، بیروت۔ (۲۲) ابن الندیم نے اس دور میں مرتب ہونے والی متعدد کتب کے حوالے دیئے ہیں۔ جن کے ناموں میں سیرۃ کا لفظ شامل تھا جیسے کتاب سیرۃ ابی بکر وفاتہ (ص ۱۳۲)، کتاب سیرۃ اردشیر، کتاب سیرۃ انوشرواں، کتاب سیرۃ عثمان (ص ۲۴۶)، کتاب سیرۃ عمر (ص ۲۴۶) وغیرہ۔ (۲۳) دیکھیے، ابن الندیم، الفہرست، طبع فلوگل بذیل سیرۃ، بذیل اشاریہ۔ (۲۴) ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مقدمہ، سیرت محمد بن اسحاق، مطبوعہ، دارالنفائس لاہور، ص لب۔ (۲۵) ابن الندیم، الفہرست، ص ۸۹، اس کے متعلق ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ اُس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا، مگر آپ سے کچھ نہیں سنا امیر معاویہ کے کہنے پر اس نے کتاب الامثال اور کتاب الملوک مرتب کی، اس نے طویل عمر پائی (المعارف، مطبوعہ لائیڈن، ص ۲۶۵)۔ (۲۶) دیکھیے حضرت حسان بن ثابت کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر دردمرثیہ در، ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ۴/۶۶۶، طبع مصطفیٰ السقاء وغیرہ۔ (۲۷) دیکھیے ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، مطبوعہ بیروت۔ (۲۸) ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی، مغازی عروہ، مطبوعہ ریاض ۱۴۰۱ھ، ص ۴۸۔ (۲۹) ابن حجر، الاصابہ، بذیل عبداللہ بن عباسؓ۔ (۳۰) ایضاً۔ (۳۱) بحوالہ ابن سعد، طبقات، ۵/۲۱۶۔ (۳۲) البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب ۳۴۔ ابن ماجہ، مقدمہ، باب ۴۲۔ (۳۳) ابن سعد، طبقات، مطبوعہ دار صادر، بیروت، ۵/۱۵۲۔ (۳۴ الف) ایضا۔ (۳۴) حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت مدینہ منورہ میں جلیل القدر صحابہ کرام درس وتدریس میں مصروف تھے، جن کی تفصیل کتب تذکرہ و سوانح میں مل سکتی ہے۔ (۳۵) الذھبی، سیر اعلام النبلاء، مطبوعہ بیروت، ۴/۳۵۱، ۳۵۳۔ (۳۶) ایضا۔ (۳۷) البخاری، محمد بن اسماعیل، تاریخ، ۱/۴۵۰۔ مطبوعہ بیروت۔ (۳۸) ابن سعد، ۵/۱۵۲۔ (۳۹) ایضا۔ (۴۰) الترمذی، ابوعیسی، الجامع السنن، کتاب الدعوات، حدیث ۳۳۸۵۔ (۴۱) ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ مقدمہ سیرت ابن اسحاق، مطبوعہ دارالنفائس، کریم پارک لاہور، ۱۳۲۶ھ/۲۰۰۶ء۔ ص یب وتح بحوالہ وسٹنفلٹ، مورخ والعرب (The Arab historians)۔ (۴۲) ایضا، ص یو۔ یز۔ (۴۳) احمد امین، ضحیٰ الاسلام، قاھرہ، بار سوم، ۱۹۵۲ء، ۲/۳۱۹۔ (۴۴) ڈاکٹر محمد ماہر حمادہ، مرجع مختارہ عن حیاۃ رسول اللہؐ، مطبوعہ الریاض، ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۳ء ص ۲۲۔ (۴۵) الزبیر بن بکار، الموفقیات، مطبوعہ قاہرہ، ص ۲۲۲، ۲۲۳۔ (۴۶) ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی، مغازی رسول اللہ لعروہ، مطبوعہ الریاض ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء، ص ۲۸۔۲۹۔

راجہ رتن سنگھ زخمی
اور قصیدۂ ہفت بند در منقبت شیرِ خدا
امیر المومنین حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہٗ

ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب

(۱)

بڑے شاعر دیگر عبقری شخصیات کی طرح اپنے عہد کی تہذیبی اقدار کے نمائندہ ہوتے ہیں جن کی بازخوانی یا مطالعۂ ثانی سے اس عہد کے تاریخی حقائق کا احیاء ہوتا ہے اور اس مطالعے کے ضمن میں ہی نئے حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ تاریخ نویسی کا مطالبہ بھی یہی ہے کہ تاریخ کے ادنیٰ و اعلیٰ حقائق پر مسلسل نظر ثانی کی جائے۔

نوابین اودھ کے دور حکومت (۱۷۷۲ء تا ۱۸۵۷ء) میں شمالی ہند کے دیگر علاقوں کے سیاسی انحطاط کے بعد شعراء، علماء، فضلاء کا لکھنؤ میں مجمع لگ گیا۔ شعراء میں زیادہ تعداد اردو شعراء کی تھی۔ ان کے علاوہ متعدد فارسی کے شعراء بھی تھے جن کو دبستان لکھنؤ کے مطالعے میں مناسب جگہ نہیں ملی۔ ان فارسی گویان کی ادبی خدمت اور مشترکہ تہذیبی اقدار کی شناخت منظر عام پر نہیں آئی جس کی عہد حاضر کے جہد جدید میں سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

راجہ رتن سنگھ زخمی اودھ کی ادبی تاریخ کی ایک عبقری شخصیت تھے۔ وہ اس عہد کے تہذیبی ماحول کے نمائندہ تھے۔ ان کی گوناں گوں علمی و ادبی خدمت کی بازخوانی موجودہ ماحول میں خالی از افادہ نہیں۔ ان کی شخصیت اور ان کے ادبی و علمی اکتساب کے مطالعے سے جہاں اس

۷۳ پھول والان، بریلی (یوپی) 243003۔

عہد کی غیر معمولی فنی عظمت کا احساس ہوتا ہے وہیں عہد حاضر کے ادبی و علمی ماحول میں ان جیسی قد آور شخصیت کو نظر ڈھونڈھتی ہے۔

راجہ رتن سنگھ کے حالات مختلف ذرائع سے جمع کرنے کے بعد اس طور پر مرتب ہوتے ہیں:

نام رتن سنگھ۔ تخلص زخمی۔ والد کا نام بالک رام تخلص صبوحی (۱) جو مہاراجہ جھاؤ مل کے نائب اور نواب آصف الدولہ (م ۱۷۹۷ء) کے میر آتش تھے۔ لکھنؤ میں توپ خانہ بالک رام ان کے نام سے منسوب ہے۔ رتن سنگھ زخمی کے دادا نواب آصف الدولہ کے معلم تھے۔ نانا کا نام بھگوان سہائے اور تخلص شہید تھا (۲)۔ آصف الدولہ کے عہد حکومت (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) میں وہ بھی مفتخر ہوئے۔ زخمی کے والد اور نانا راجہ کہلاتے تھے۔ مصحفی نے شاید اسی رعایت سے زخمی کو کنور جی تحریر کیا ہے (۳)۔ زخمی اور ان کے قرابت داروں کا تعلق جن میں جواہر سنگھ جوہر (م ۱۸۸۰ء)، منو لال فلسفی (م ۳۳-۱۸۳۲ء) اور ان کے فرزند کندن لال اشکی (م ۱۸۵۰ء) بھی شامل ہیں، مسقط الراس بریلی تھا۔ کائستھوں کا یہ خاندان حضرت شاہ نیاز احمد نیازؒ بریلوی کی خانقاہ نیازیہ سے فیضیاب ہوا تھا۔ زخمی کے قصیدہ ہفت بند کے مندرجہ ذیل سے شعر سے ان کی بریلوی نسبت کا ثبوت ملتا ہے۔

تا کے ایں درد غربت تا کے ایں رنج سفر
در بریلی باز کے بینم دل خود را بکام (بند ۷ - شعر ۵)

راجہ رتن سنگھ زخمی کی پیدائش ۲۳ر محرم ۱۱۹۷ ہجری مطابق ۲۹ر دسمبر ۱۷۸۲ء کو لکھنؤ میں ہوئی (۴)۔ لکھنؤ میں ہی ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ مصحفی نے ان کو ایک مشاعرے میں مرزا حاجی (۵) کے دولت کدے پر دیکھا اور سنا تھا۔ ان کے متعلق مصحفی نے تحریر کیا:

''جوانے وجیہ و قابل و دانا و مہذب الاخلاق است''۔ (۶)

مصحفی نے یہ بھی اطلاع دی کہ زخمی مرزایانہ وضع رکھتے تھے اور مشاعرے میں کلام سناتے وقت مردم ولایت کا اتباع کرتے تھے:

''وضع مرزایانہ دارد۔ در خواندن شعر ہم تتبع مردم ولایت می کند''۔ (۷)

مصحفی کے بقول زخمی محمد حسن قتیل کے شاگرد تھے:

''شاگرد مرزا قتیل مرحوم شدہ می گویند''۔(۸)

اس وقت زخمی کی عمر قریب چالیس کی ہو چکی تھی:

''عمرش قریب بہ چہل سال رسیدہ''۔(۹)

علی حسن خاں نے زخمی کے علم و فضل کے متعلق بتانا:

''با کثر علوم عربی و فارسی وترکی و انگریزی و سنسکرت آشنائی داشت''۔(۱۰)

سری واستو نے مطلع کیا:

''علوم عقلیہ و نقلیہ خود بڑی دلچسپی سے حاصل کیے''۔(۱۱)

سری واستو نے زخمی کی ملازمت کی تفصیل دیتے ہوئے تحریر کیا:

''ابتدا میں وہ کمپنی سرکار کے ملازم تھے......آپ نصیر الدین حیدر کے اتالیق بھی رہے پھر داروغگی کا عہدہ سنبھالا۔ آخر حیات میں میر منشی مقرر ہوئے ...... بادشاہ محمد علی نے بھی ان کو پہلے میر منشی مقرر کیا پھر محکمۂ دیوانی کی خدمات سپرد کیں۔ لیکن جب احمد علی شاہ بادشاہ ہوئے تو ان کو دونوں عہدوں سے معزول کر دیا''۔(۱۲)

سری واستو نے زخمی کے خطابات کے متعلق اطلاع دی:

''اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے بعد بہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ منشی الملوک فخر الدولہ اور دبیر الملک کے خطابات پائے''۔(۱۳)

غیر مطبوعہ قصیدۂ ہفت بند میں ''ہشیار جنگ'' بھی مضاف ہے۔

علی حسن خاں نے مزید مطلع کیا:

''در زمانۂ محمد علی شاہ سومیں (؟) شاہان لکھنؤ و منصب دیوانی آں ریاست وخطاب مہاراجگی کلاہ گوشہ بآسماں سود دی''۔(۱۴)

علی حسن خاں نے زخمی کے دین اسلام قبول کرنے اور وفات کے متعلق تحریر کیا:

''و پایان کار در سنہ یک ہزار و دو صد و شصت و چہار دین اسلام راملت حقہ یافتہ اختیار نمود و بعد سہ سال در ۱۲۶۷ھ راہ آخرت پیمودہ''۔(۱۵)

سری واستو نے زخمی کے دین اسلام قبول کرنے کی اطلاع ضرور دی لیکن سال وفات دیگر بتائی:

''آپ نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ ۶۱ کی عمر میں ۱۸۵۶ء میں آپ کا انتقال ہوا''۔

سری واستو سے سہو ہوا۔ زخمی کی پیدائش ۱۱۹۷ھ اور وفات ۱۲۶۷ھ میں ہوئی تھی۔ اس طرح باعتبار سن ہجری عمر ۷۰ سال کی ہوئی۔ باعتبار سن عیسوی ۱۷۸۳ء تا ۱۸۵۱ء عمر ۶۸ سال کی ہوئی۔ ان کا ۶۱ سال کی عمر میں فوت ہونا درست نہیں۔ راجہ رتن سنگھ زخمی نے فارسی زبان میں نثر و نظم کی کتب تصنیف کیں جن کے اسماء مندرجہ ذیل ہیں:

کتب نثر: حدائق النجوم، سلطان التواریخ، انیس العاشقین، جام گیتی نما، معیار الزماں، شرح گل کشتی، انشائے زخمی، ان میں حدائق النجوم اور سلطان التواریخ یعنی شاہان اودھ کی دو جلدوں میں تاریخ (۱۸۴۱ء) مطبع نول کشور لکھنؤ سے طبع ہو چکی ہیں۔

کتب نظم: دیوان زخمی مطبوعہ جمادی الآخر ۱۲۵۳ھ مطابق ستمبر ۱۸۳۷ء در مطبع سنگین محمدی لکھنؤ۔ یہ دیوان خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ نمبر کتاب HL1537 اور HL1538، تعداد صفحات ۵۱۳۔

قصیدہ ہفت بند در منقبت شیر خدا امیر المومنین حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہٗ۔ (۱۹)

راجہ رتن سنگھ زخمی کا جو کلام مختلف ذرائع سے حاصل ہوا، اس کا انتخاب مندرجہ ذیل ہے ؎

احباب پر سید زحال دل زخمی — زخمی بدل خویش نمائید خدارا
برنگ شمع زخمی در فراق آتشیں روئے — برآید شعلہ جانسوز از دل منقل مارا
اگر بیتابی ایں دل ہمیں است — دریغا زندگی شد مشکل ایں شب
چہ شد کہ میکند اظہار رنجش زخمی — ہزار زخم نہاں دردل وجگر پیداست
از عشق گریز نیست مارا — زخمی چکنیم نوجوانے است
خود پشیماں شدی ز رنجش یار — زخمی اظہار اضطراب چہ بود
ہمنیش بر سر راہی کہ مپرس — خوردہ ام تیر نگاہی کہ مپرس

زخمی بسرت رسید قاتل تسلیم و رضا مکن فراموش
برنعش زخمی بود شاہدم تماشائی عجب درگریہ طفلی یکطرف مردم بغوغا یکطرف
کاکلش دام بلائیست کہ من میدانم نگہش تیر قضائیست کہ من میدانم

(مرسلہ ڈاکٹر سید مسعود حسن از خدابخش لائبریری پٹنہ۲۰)

بس کہ قرب مدعی درخاطرش جا کردہ است بہر قتلم حیلہ ہائے تازہ پیدا کردہ است
پس از ہر جنگ صلحش گرچہ لذت بیشتر دارد ولے بر ہر سخن جنگش تماشائے دگر دارد
چہا چہا کہ نہ دیدم من از جفائے فراق مباد روزی کس ہمچو من بلائے فراق
جگر نہند بہ خوں جان بلب رسیدا ے وائے من ستم زدہ وایں عذاب ہائے فراق
ازیں بلاست رہائی مرا کجا ممکن فراق بہرمنت ونم برائے فراق
اضطراب تو و بیتابی لبسمل دارم یارب ایں درد چہ درداست کہ در دل دارم
وائے زیں حسرت دیدار کہ درخوں شب وروز دست و پامی زنم وخوں سوئے قاتل دارم
یار بہ غیر بروں رفتہ ومن خانہ خراب نیست معلوم چرا جائے بہ محفل دارم
کے کے تو از صبا بہ کنار من آمدی ما مردم از غم وبہ مزار من آمدی
عتاب آلودہ می آئی ودر کف خنجرے داری مرا اول بہ کش گر قصد قتل دیگرے داری

(مصحفی۔ ریاض الفصحا،ص۱۱۵و۱۱۶)

زقتلم آں جفا جو ہم پشیمانی کشید آخر کہ بعد از مردنم بردر گرفتاری ندید آخر
رختی از دیدۂ و دل بے تو طپانست ہنوز یاد شبہائے وصال آفت جانست ہنوز

(علی حسن خاں، صبح گلشن،ص۱۸۹)

از دیدن تو کافر عجبی نیست کہ در حشر صدبار زنم پیش خدا چاک کفن را
تا دل شد آوارہ درآں لطف پریشاں اشک است بشام سفر صبح وطن را
بخشد اگر جان و دم لبسمل عجبی نیست آبی است دگر خنجر آں عہد شکن را

(سری واستو، یوگدان،ص۱۲۹)

کجا خواب وخورش وکوچشم صبح وا کردن من و ہر شب ز درد دل بکویش نالہا کردن

شودتا دررہ معشوق روزی جاں فدا کردن چہ باشد عاشقی خود را بغمہا مبتلا کردن
بصد خون جگر بیگانہ ای را آشنا کردن

گرفتن جا نمن جا کرد از بیداد او برلب کشیدم صد جفا روز و دیدن صد بلا ہر شب
بصد تقریب کردم پیش او اظہار بر مطلب چہ حاصل زینہمہ افسانہ مہر و وفا یارب
کہ نتواں در دل بی مراد یکذرہ جا کردن

عجب نہ بود گر باینہمہ بیرحمی جاناں کند زخمی فدا در راہ او جان و دل و ایماں
ہمیں بوداست طرز عاشقانِ کشتۂ ہجراں فغانی کمتریں باز یست درعشق مگو ادیان
جفا از بیوفا دیدن و نامش را وفا کردن

(مخمس برغزل فغانی (۲۱)، یوگدان، ص ۱۳۰)

درماندہ ام وہم نفسی نیست مرا می نالم و فریاد رسی نیست مرا
یارب بنظر بحال زارم از رحم جز مسلم و جز تو کسی نیست مرا

(رباعی، یوگدان، ص ۱۲۹)

بدھ پرکاش گپتا جوہر دیو بندی نے زخمی کے پانچ اردو اشعار نقل کیے ہیں لیکن ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ وہ اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

کیا ہوائے نفس پر غالب ہو انسان ضعیف کچھ ہوا سے زور چل سکتا نہیں ہے کاہ کا
حاسد کج فہم تیغ رشک سے بسمل ہوئے مدح خواں جب سے ہوا زخمی رسول اللہؐ کا
جگر نوحہ کناں ہے دل کف افسوس ملتا ہے ہزاروں حسرتوں کے ساتھ میرا دم نکلتا ہے
دوستو دفن میں کس واسطے یہ عجلت ہے مرے مرنے کی انہیں بھی تو خبر ہونے دو
کہہ دو یہ طبیبوں سے عبث لکھتے ہیں نسخے بیماریٔ دل کی تو دوا اور ہی کچھ ہے

(موج گنگ، ص ۱۸۵)

تذکرہ نگاروں نے زخمی کے کلام کا انتخاب اپنی پسند کے مطابق کیا ہے جس کا مطالعہ کرنے کے بعد زخمی کے علم وفضل، پرواز تخیل، نکتہ رسی اور اسلوب بیان کی چستی و پختگی کا اعتراف کرنے میں تامل نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی زود حسی اور افسردگی بھی متاثر کرتی ہے۔ ان

کی خوش حال زندگی میں درد وغم کی کسک فطری معلوم ہوتی ہے۔

(۲)

قصیدۂ ہفت بند در منقبت شیر خدا امیر المومنین حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہٗ۔

مشہور مورخ، ماہر تعلیم، صحافی اور مصنف سید الطاف علی بریلوی (م ۲۴/اکتوبر ۱۹۸۶ء) نے سہ ماہی مصنف علی گڑھ بابت مارچ ۱۹۴۶ء میں مذکورہ بالا قصیدہ ہفت بند شائع کیا تھا۔ یہ ہفت بند ان کے دیوان میں شامل نہیں ہے جیسا کہ ڈاکٹر سید مسعود حسن نے خدا بخش لائبریری پٹنہ سے اپنے مکتوب مورخہ ۱۴/اگست ۲۰۱۰ء کے ذریعہ راقم الحروف کے استفسار پر مطلع کیا۔ راقم الحروف کو اس ہفت بند کی موجودگی کا کسی اور ذریعہ سے بھی علم نہیں ہوا۔ لہٰذا زخمی کی شاعری پر گفتگو کرتے وقت اس نو دریافت ہفت بند کا تعارف لابد معلوم ہوا جو مندرجہ ذیل ہے۔ سید الطاف علی بریلوی مدیر مصنف علی گڑھ نے بطور تمہید تحریر کیا:

> ''......درج ذیل قصیدہ ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء کی تصنیف ہے جس کا نہایت مطلا اور مذہّب نسخہ جو فن خطاطی کا قابل دید نمونہ ہے کتاب خانہ اسلامیہ انٹر کالج بریلی میں محفوظ ہے۔ کاتب کا نام اندر جیت تحریر ہے............ محبی سید مسعود الحسن صاحب ایم اے پرنسپل کالج مذکور جن کی عنایت سے ہمیں اس قصیدہ کی نقل حاصل ہوئی فرماتے ہیں کہ ان کو یہ قیمتی نسخہ مولوی حسین احمد صاحب مرحوم ساکن نصیر آباد (ضلع رائے بریلی) کے ذاتی کتب خانہ سے حاصل ہوا تھا۔ مولوی صاحب کی بابتہ بیان کیا کہ مرحوم فقہ اور حدیث کے صاحب تصانیف عالم اور مہاراجہ صاحب بہادر جہانگیر آباد (اودھ) کے استاد تھے۔ ۱۹۲۲ یا ۱۹۲۳ء میں انتقال فرمایا۔ جناب مولوی محمد محسن صاحب (۲۲) استاد فارسی اسلامیہ انٹر کالج بریلی کا بھی شکر واجب ہے کہ انہوں نے از راہ مہربانی اس قصیدے کو نقل کر کے ہمیں دیا''۔

جناب مسعود الحسن نقوی (م ۲۸/مئی ۱۹۹۵ء) نے یہ نادر نسخہ ایک شیشے کے کیس میں بند کرا کے لائبریری میں محفوظ کر دیا تھا۔ آں موصوف تقسیم وطن کے بعد کراچی چلے گئے۔ ان کے

ترک وطن کے بعد کالج کے سربراہوں کی آمد وشد جاری رہی اور ان میں سے کسی ایک کے زمانے میں مذکورہ نسخہ ہفت بند کالج کی لائبریری سے غائب ہوگیا۔ دریافت کرنے پر اس کا سراغ نہیں ملا۔ بسا غنیمت سید الطاف علی بریلوی نے اس ہفت بند کو اپنی ادارت میں نکلنے والے سہ ماہی مصنف علی گڑھ بابت مارچ ۱۹۴۶ء میں شائع کرادیا تھا جس کا تراشہ راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے۔ تاہم یہ نادر قصیدہ اصل مخطوطے کی عدم موجودگی میں اور نقل در نقل کے مراحل سے گزر جانے کے سبب مرتب نہیں کیا جاسکا اور اس کے اجمالی تعارف پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ اس قصیدہ ہفت بند کے آخر میں یہ عبارت ملتی ہے:

''بتاریخ غرہ رمضان المبارک ۱۲۵۴ ہجری ہفت بند تصنیف منشی الملوک فخر الدولہ دبیر الملک راجہ رتن سنگھ بہادر ہشیار جنگ تخلص بہ زخمی بخط فدوی عقیدت نہاد اندر جیت سمت......تحریر پذیرفت''۔

سمت کی جگہ خالی ہے۔ تاریخ باعتبار سن عیسوی ۱۷ر نومبر ۱۸۳۸ء اور باعتبار سمت بکرمی ۱۸۹۵ء برآمد ہوتی ہے۔ صنف ہفت بند کے متعلق اظہار رائے کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہفت بند کی صنفی خصوصیات کی تفہیم سے زخمی کے زیر قلم ہفت بند کی تفہیم میں مدد ملے گی۔

ہفت بند نظم کی ایک قسم ہے۔ اس میں سات بند ہوتے ہیں۔ ہر بند میں دس یا گیارہ اشعار ہوتے ہیں۔ بند کا آخری شعر ترکیب بند کی طرح جدا قافیے اور ردیف میں ممیّز ہوتا ہے۔ ہفت بند میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مدح کی جاتی ہے۔ اسلوب بیان پر شکوہ ہوتا ہے۔

ہفت بند کا تعلق ایران کی فارسی شاعری سے ہے۔ ہفت بند کا مشہور ترین مصنف ملا حسن کاشی ہے۔ مقام حیرت ہے کہ ہفت بند اور ملاحسن کاشی کے متعلق مفصل اور محقق معلومات کا فقدان ہے۔ براؤن (E.G. Browne) نے فارسی ادب کی تاریخ میں اور مولانا شبلی نعمانی نے شعر العجم میں ہفت بند اور ملاحسن کاشی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لہٰذا ملاحسن کاشی کے حالات کی جستجو کرنا پڑی جس کے دوران سب سے پہلے نظامی بدایونی (م ۱۹۴۷ء) کی یہ تحریر نظر سے گزری:

''حسن کاشی مولانا۔ کاشان کا رہنے والا۔ فارسی شاعر تھا۔ بہت سی غزلیں اور قصیدے اس کے مشہور ہیں۔ ہفت بند کاشی اس کی تصنیف ہے۔ تاریخ

وفات معلوم نہیں ہوئی ۔صرف اس قدر پتہ چلا ہے کہ یہ شاعر آٹھویں صدی ہجری میں گزرا ہے''۔(قاموس المشاہیر، ج ا، اشاعت ثانی ۲۰۰۴ء، خدابخش اورینٹل لائبریری پٹنہ،ص ۱۹۶)

ایران میں آٹھویں صدی ہجری کا تعلق دور تیموریہ سے ہے یعنی ۶۱۷ھ تا ۹۰۸ھ مطابق ۱۲۲۰ءتا۱۵۰۲ء۔گویا ملاحسن کاشی کا عہد،عہد صفویہ سے فوراً پہلے کا ہے۔

اس کے بعد جو دوسری تحریر نظر سے گزری وہ نواب سید احمد حسین خاں سالک لکھنوی کی ہے۔انہوں نے ملاحسن کاشی کے ہفت بند کو مخمس کیا ہے جو ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ءکو مطبع شعلہ طور کانپور سے طبع ہوکر شائع ہوا تھا۔سالک لکھنوی نے اس ''خمسہ ہفت بند کاشی'' میں ''ملاحسن کاشی'' ہی درج کیا ہے۔(ص ۲۲)

تیسری تحریر جو نظر سے گزری وہ حیدر حسین راقم صدیقی بریلوی کے خمسہ ہفت بند کاشی مسمی ہفت کوکب ۱۲۷۹ھ/۱۸۷۲ءکی ہے۔یہ ہفت بند روہیل کھنڈ پریس بریلی میں طبع ہوا تھا۔اس مطبع کے مہتمم اور مالک سید یادعلی نے ٹائٹل صفحہ پر ''ملاحسن مشہور بہ کاشی'' تحریر کیا اور جب بزبان فارسی کتاب پر تقریظ تحریر کی تو ''ملاحسن کاشی آملی'' (ص ۲۱) ''ملاحسن کاشی آملی متخلص بکاشی'' (ص ۲۳) درج کیا۔لہٰذا ان مندرجات کے پیش نظر علم وفضل کی رعایت سے ملّا اور نام کی رعایت سے حسن تو درست نظر آتا ہے البتہ ان کا وطن کاشان تھا یا امُل (ماژندران میں) اور تخلص حسن تھا یا کاشی غور طلب امور ہیں۔راقم الحروف کے قیاس میں نظامی بدایونی کی معلومات کی بنیاد پر کاشان کی رعایت سے کاشانی اور نام کی رعایت سے حسن تخلص صحیح معلوم ہوتا ہے۔یعنی ملاحسن کاشانی متخلص بہ حسنؔ۔

سید یادعلی کی تقریظ کے مطالعے سے جس دلچسپ روایت کا علم ہوتا ہے اس سے ہفت بند کے ا-سبب تالیف،۲-موضوع سخن،۳-مصرعہ طرح کی آگاہی ملتی ہے۔قدیم طرز تحریر میں فارسی زبان کی اس طویل روایت کو نقل کرنے کے بجائے اس کے خلاصے کو اردو میں درج کرنا زیادہ صحیح معلوم ہوا جو اس طور پر ہے:

''ملاحسن کاشی آملی متخلص بہ کاشی جو باوقار عالم وفاضل تھا، اتفاقاً مرض

برص میں مبتلا ہوا۔ علاج و معالجہ سے فائدہ نہیں ہوا۔ دن بہ دن مرض بڑھتا گیا۔ حکماء مایوس ہو گئے اور جواب دے دیا۔ اس نے عالم یاس میں حلال مشکلات سے رجوع کیا اور کشایش عقدہ مدعا کو خیبر کشا کے حوالے کر دیا۔ اسی زمانے میں اس نے با خلاص تمام یہ ہفت بند نظم کیا۔ ہفت بند کو نظم کرتے وقت مصرعہ ثانی کہنے میں طبیعت موزوں نہیں ہوتی تھی لیکن وھبی طور پر یہ عقدہ حل ہو گیا۔ ہاتف غیبی نے اس کے کان میں ندا دی ع لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار۔ ملا شاد و فرحاں ہوا اور اپنی نظم میں اس کو ضم کر لیا۔ ملا کو مرض سے نجات مل گئی اور یہ ہفت بند تمام عالم میں مقبول و مشہور ہوا''۔ (ص ۲۲ و ۲۳)

اس روایت میں کتنی سچائی ہے، اس وقت یہ طے کرنا ممکن نہیں ہے۔ خود راوی نے ''روایت مشہور و متفق علیہ آنست'' کی تمہید سے اس کو تسلیم کر لیا ہے۔ تاہم جملہ تحریرات کو مدنظر رکھنے کے بعد برائے اتمام حجت نام و تخلص حسن اور مولد کاشی قبول کرنے میں مضائقہ نہیں ہے۔

ہفت بند کاشی کو غیر معمولی شہرت میسر ہوئی۔ ہندوستان میں شیعہ نوابین اودھ کے لکھنؤ میں مہاراجہ رتن سنگھ زخمی نے حسن کاشی کی زمین میں ہفت بند قلم بند کیا۔ دیگر شعراء نے حسن کاشی کے ہفت کو بہ صورت خمسہ تضمین کیا۔ مثال میں راجہ الفت رائے الفت لکھنوی (م ۱۸۵۴ء) (۲۳) نے اور نواب سید احمد حسین خاں سالک لکھنوی نے ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ میں حسن کاشی کے ہفت بند کو مخمس کیا۔ بریلی کے حیدر حسین راقم صدیقی نے ''ہفت کوکب'' کے عنوان سے حسن کاشی کے ہفت بند کو مخمس کیا (۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء)۔ اس کا مطبوعہ نسخہ رامپور رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے (۲۴)۔ (نمبر کتاب نظم فارسی ۴۱۳۳) صف شعراء میں رتن سنگھ زخمی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ملا حسن کاشی کے ہفت بند کی زمین میں ہی تمام و کمال اپنا ہفت بند تصنیف کیا ہے۔ یہ ہفت بند ان کے مطبوعہ کلام میں شامل نہیں ہے۔ اس ہفت بند کے اجمالی تعارف کی وجہ سے ہی یہ مضمون قلم بند کرنا پڑا جس کے ضمن میں مہاراجہ رتن سنگھ زخمی کے حالات و علمی و ادبی کارناموں کی بازخوانی بھی ہو گئی۔ حسب روایت زخمی کا ہفت بند بھی شیعہ مسلک کے مطابق ہے۔

راجہ رتن سنگھ زخمی کے ہفت بند کی ساخت اس طور پر ہے:

ہفت بند کے پہلے بند میں ۱۱ دوسرے بند میں ۱۰، تیسرے بند میں ۹ چوتھے بند میں ۱۰، پانچویں بند میں ۱۰، چھٹے بند میں ۱۰ اور ساتویں بند میں ۱۱ اشعار ہیں۔ ان بندوں کے مابین ترکیب بند کی طرح ممیّز اشعار کی تعداد ۷ ہے۔ اس طرح ہفت بند کے کل اشعار کی تعداد ۷۸ ہے۔ حسن کاشی کے ہفت بند کی ساخت اور تعداد اشعار بھی یہی ہے۔ بطور شہادت زخمی اور حسن کاشی کے ہفت بندوں کے مطالع کے مصرعہائے دوم کو درج کیا جاتا ہے:

بنداول	مصرعہ دوم زخمی	ماہ برج برتری مہر سپہر داد و دیں
	// حسن کاشی	آسماں عز و تمکیں آفتاب داد و دیں
بنددوم	// زخمی	روضہ رضواں شدی برقدسیاں رشک قفس
	// حسن کاشی	بستہ بر مہر تو ایزد مہر حور العین بس
بندسوم	// زخمی	آفتابے تافتہ جاں نورہا دریافتہ
	// حسن کاشی	آفتاب از سایہ چتر تو افسر یافتہ
بندچہارم	// زخمی	باقی از صلب تو در عالم نشان مصطفےٰ
	// حسن کاشی	قبلہ دنیا و دیں جان جہان مصطفےٰ
بندپنجم	// زخمی	خواند مولیٰ مصطفایت یا امیر المومنین
	// حسن کاشی	خواندہ نفس مصطفایت یا امیر المومنین
بندششم	// زخمی	خواہش حسن آفریں رمزے زفرمان شماست
	// حسن کاشی	دور دوران فلک دوری ز دوران شماست
بندہفتم	// زخمی	افسر سلطانی و اکلیل شاہی صبح و شام
	// حسن کاشی	خاک او دارد شرف بر زمزم بیت الحرام

اس وقت بخوف طوالت کلام زخمی اور حسن کاشی کے ہفت بندوں کے مابین تقابلی جائزے کی گنجائش تو نہیں ہے البتہ ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ زخمی نے حسن کاشی کے ہفت بند کی زمین میں ہی ہفت بند کیوں تحریر کیا۔ اس سوال کے دو جواب ہو سکتے ہیں۔

۱- حسن کاشی کا ہفت بند بہت مقبول تھا خاص طور پر اس عہد کے لکھنؤ میں جہاں شاہان

اودھ شیعہ مسلک کے پیرو تھے ۔ لہٰذا زخمی نے حسن کاشی کے ہفت بند کی زمین میں اپنا ہفت بند تحریر کیا۔

۲-حسن کاشی کے ہفت بند کی زمین میں ہفت بند تحریر کرنے کے عقب میں زخمی کا جذبہ تقابل ومسابقت بھی کارفرما ہوسکتا ہے۔اور یہ بات بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتی ۔زخمی السنہ عربی وفارسی، دین ومسلک اور تاریخ وروایات پر تو عبور رکھتے ہی تھے،علوم عقلیہ جیسے علم النجوم پر ان کی دسترس حسن کاشی کے مقابلے میں زیادہ نظر آتی ہے ۔ دراصل زخمی کے ہفت بند میں قصیدے کا شکوہ ہے جو حسن کاشی کے مقابلے میں اس کا مثبت نکتہ ہے۔

صاحب شعر الہند کے بقول قصیدے کے اساسی اوصاف میں عقل شجاعت عدل اور عفت ہیں اور ان اوصاف کے انفرادی یا ترکیبی اقسام یعنی علم وحلم،حمیت وہیبت،فیاضی،قناعت، معمولی معاش پر زندگی بسر کرنا وغیرہ کو قدماء نے ضروری قرار دیا ہے (۲۵) ۔ یہ تمام اوصاف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات میں موجود ہیں جن کو شاعر نے نظم کیا لیکن ہفت بند کی شکل میں ہونے کی وجہ سے قصیدے کی طرح ان میں داخلی ترتیب نہیں ہے ۔ ایک ہی بند میں مختلف اوصاف کی مدح اور دیگر بندوں میں ان کی تکرار بھی ملتی ہے۔

نمونہ کلام: قصیدہ ہفت بند کے وہ اشعار جن میں شاعر نے اصطلاحات نجوم کو استعمال کیا۔

السلام اے مشرق انوار رب العالمین ماہ برج برتری مہر سپہر داد و دیں (بند۱-شعر۱)

جب ستارہ اس برج میں ہوتا ہے جو اس کا بیت ہے تو وہ اس کا بیت مشرف ہوتا ہے۔ مراد برج ثور یعنی بہت روشنی دینے والا ۔شعر کا ترجمہ یہ ہوگا کہ اے منبع نور الٰہی اے بیت مشرف کے ماہ تاباں اور اے آسمان دین و دیانت کے مہر درخشاں آپ پر ہمارا سلام ہو۔

مشتری سیرت زحل رفعت مہ بہرام روز نیست شاہا خبر تو کس بر آسماں مصطفیٰ (بند۴-شعر۴)

مشتری سب سے زیادہ روشن سیارہ اور معبد اکبر، مقام فلک ششم، زحل سب سے زیادہ بلند سیارہ ، مقام فلک ہفتم ۔ بہرام یعنی مریخ ایک سال میں دس ماہ استقامت میں رہنے والا ، مقام فلک پنجم ،شعر کا ترجمہ یہ ہوگا کہ آپ مشتری کی طرح روشن اور سعد اکبر ہیں ۔آپ زحل کی طرح سب سے زیادہ بلند ہیں ۔آپ بہرام کی طرح استقامت میں سردار زمانہ ہیں ۔اے مولا

فلک مصطفیٰ پر آپ کا ہمسر کوئی دوسرا سیارہ نہیں ہے۔

قصیدہ ہفت بند کے وہ اشعار جن میں ممدوح کی شجاعت کا مذکور ہوا۔

منجی سلماں بدشت ارزنہ از دست شیر　　شیر یزداں شاہ مرداں نفس خیر المرسلین　(بند۱-شعر۷)

حضرت سلمان فارسیؓ (م ۳۶ھ/۶۵۷ء) صحابی رسولؐ تھے (۲۶)۔ دشت (۲۷) ارژنہ میں ان کو غائبانہ طور پر شیر کے دست سے نجات دلانے کا واقعہ فضیلت علی کرم اللہ وجہہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ واقعے کی پوری تفصیل ترجمہ مناقب رضوی یعنی کوکب دری فی فضائل علی میں موجود ہے (ص ۲۶۲ تا ۲۶۴) جس کو بوجہ طوالت نقل نہیں کیا جاسکا۔ دراصل اس واقعے کے ذریعہ یہ بات بتانا منظور تھی کہ حضرت آدمؑ کے زمانے سے انبیاء، اولیاء، صلحاء اور اتقیا میں جو کوئی بھی کسی بلا یا تکلیف میں مبتلا ہوتا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان کو بلا و رنج سے رہا کرتے تھے۔ (ص ۲۶۴)

شعر کا ترجمہ یہ ہوگا کہ مولا علی حضرت سلمان فارسی کو دشت ارژنہ میں دست شیر سے نجات دلانے والے، اللہ کے شیر اور بہادر مردوں کے سردار ہیں۔ ان کا لقب نفس رسول ہے۔

زخمی نے مولا علی کرم اللہ وجہہ کی شجاعت کے وصف میں ایک دیگر مشہور روایت کے حوالے سے تحریر کیا۔

پہلوانے چوں عمر را کشتہ از ضربتے　　جاں نصیر از لطف جاں بخشت مکرر یافتہ　(بند۳-شعر۷)

عمرو بن عبدود ایک طاقت ور جنگ آزمودہ محارب تھا جس کو احزاب (جنگ خندق) (ماہ ذی قعدہ ۵ھ/۶۲۷ء) کے موقع پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے قتل کیا تھا (۲۸)۔ نصیرا ''یکے از فدایان حضرت علی کرم اللہ وجہہ بود کہ آنحضرتؐ را خدا می گفت و آنحضرت بقتل میر سانیدند باز او زندہ می شد و قصہ حیات و ممات او مشہور است......''۔ (۲۹)

یعنی ممدوح نے ایک ہی ضرب میں عمرو بن عبدود پہلوان کو قتل کر دیا اور نصیرا کو بعد ممات کئی بار حیات بخشی۔ گویا یہ قصہ حیات و ممات مولا علی کرم اللہ وجہہ کی بے مثال شجاعت کا نمونہ ہے۔

زخمی نے مولا علی کرم اللہ وجہہ کی شجاعت کے سلسلے میں ان کی جنگ خیبر (۸ھ/۶۳۰ء) میں شرکت اور فتح کا ذکر اشارۃً کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ

کوجھنڈا اس وجہ سے عطا فرمایا تھا کہ ان سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرتے ہیں اور ان کے ہی ہاتھ پر فتح ہوگی۔(حدیث ۱۳۶۳، بخاری شریف مترجم، ص ۶۰۶) بالآخر فتح ہوئی، زخمی نے ممدوح کی دیگر فضیلت کے ساتھ اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مرجع و انجم سلطان سریر لافتیٰ فخر شاہان زماں شاہنشۂ روئے زمیں (بند۱-شعر۶)

قصائد میں ممدوح کی شجاعت کے بیان میں اس کے سامان حرب اور اسلحہ کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شجاعت کے بیان میں ان کی تلوار مسمی ذوالفقار کی تعریف تو ملزوم ہے۔محمد غیاث الدین نے غیاث اللغات میں ذوالفقار کے متعلق تحریر کیا ہے:

''نام تیغ علی کرم اللہ وجہہ و حقیقتش اینکہ شمشیر عاص بن عتبہ کہ روز جنگ بدر کشتہ شدہ۔بحضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منتقل شد و از پیغمبر بمرتضیٰ علی......فقار بالفتح قطار استخوان مہرہائے پشت از گردن تا کمر...... چوں بر پشت شمشیر مذکور قطار مہرہای پشت یعنی عدیم الارتفاع ساختہ شدہ بود لہٰذا باسم ذوالفقار موسوم شد......''۔(ص ۲۱۲)

ذوالفقار کی وجہ تسمیہ و تاریخ کے ساتھ گزشتہ سطور میں بیان کردہ سید یاد حسین کی روایت کو معتبر قرار دیا جائے تو ''لافتی الاعلی لاسیف الا ذوالفقار'' ہی ہفت بند کا آغاز اور مدحت علی کرم اللہ وجہہ کی اساس ہے۔زخمی نے تحریر کیا۔

تا بدستت ذوالفقار آمد رسول حق پرست لشکر ابلیس را درخوں پتاں سر یافتہ (بند۳-شعر۸)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر (۱۷/ رمضان ۲ھ/۱۵/ مارچ ۶۲۳ء) میں آپ کی شجاعت سے متاثر ہوکر آپ کو ذوالفقار عطا کی جس سے آپ نے لشکر کفار کے سر خون میں تڑپا دیے۔

قصائد میں اسپ و اشتر کی بھی مدح کی جاتی ہے۔عرب میں محارب کی سواری میں اشتر تھا۔زخمی نے ممدوح کے اشتر کی تعریف میں تحریر کیا۔

چوں قدم برداشتہ بہر جہاد اندر رہت زیر راں صد اشتر فردوس استر یافتہ (بند۳-شعر۶)

یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ جب جہاد کی راہ میں قدم رکھتے ہیں تو آپ کی سواری کے

اونٹ کے مقابلے میں اعلیٰ نسل کے اونٹ بھی خچر ہو جاتے ہیں۔

قصائد میں مدح کے اساسی وترکیبی اوصاف میں جود وسخا بھی شامل ہے۔زخمی نے قصیدہ ہفت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سخاوت کا بھی ذکر کیا ہے۔مثال میں

ہر کرا از خرمن جودتو روزی شد جوئے کوہ زر اندر نگاہش کمتر آید از عدس (بند۲-شعر۵)

یعنی مولا علی کرم اللہ وجہہ کی سخاوت سے جو شخص بھی فیضیاب ہوا اس کی نظر میں سونے کا پہاڑ بھی مسور سے کم حیثیت کا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سخاوت کے سلسلے میں ان کا نماز کی حالت میں سائل کو چاندی کی انگوٹھی دینے کا واقعہ بہت مشہور ہے۔زخمی نے اس واقعے کو اس شعر میں ادا کیا ہے۔

کن مرا از دیگراں در دین ودنیا بے نیاز اے کہ بخشیدی بسائل مالہا اندر نماز (بند۴-شعر۱۱)

ہر چند یہ شعر دعائیہ ہے لیکن مصرعہ ثانی کے تفحص میں سید عمار علی سونی پتی نے عمدۃ البیان فی تفسیر القرآن میں اس واقعے سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فضیلت اور خلافت کا استنباط کیا ہے۔(ج۱ص۳۰۹)

حالت نماز میں سائل کو انگوٹھی بخشنے کے واقعے کی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سدرۃ المنتہی سے گزر کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عالم وجوب میں موجودگی اور جو راز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور پروردگار میں ہوئے تھے ان کو لفظاً لفظاً بیان کرنے کا مضمون نہایت معروف ہے(۳۰) جس کو زخمی نے مندرجہ ذیل اشعار میں نظم کیا ہے۔

چوں کمین سدرہ شد جبریل از رفتار ماند لامکاں بود است جابت ہمعنانِ مصطفےٰ

ورنہ دادے چوں ہشا از راز اوادنیٰ خبر بگذرو بے آنکہ حرفے برزبان مصطفےٰ

چوں بہم آمد بمعنی قوس امکاں باوجوب بود درصورت کمانت باکمان مصطفےٰ (بند۲-شعر ۵تا۷)

(۳)

راجہ رتن سنگھ زخمی نے قصیدہ ہفت بند ملا حسن کاشی کی زمین میں نظم کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیگر شعراء کے ہفت بند کے مقابلے میں جو حسن کاشی کے ہفت بند کی تخمیس ہیں، زخمی کو حسن کاشی کے ہفت بند کے معنوی تضمن سے آزادی مل گئی اور قصیدے کے پرشکوہ اسلوب میں اپنا ہفت بند

تصنیف کرنے کا موقع مل گیا۔ اس امر کے علاوہ جو دوسری حقیقت سامنے آئی وہ ہفت بند کاشی سے بہتر ہفت بند تصنیف کرنے کا جذبہ تھا جس کی وجہ سے ان کا ہفت بند تلمیحات کا گلدستہ بن گیا اور ان کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں زیادہ سے زیادہ معروف و روائی مضامین کو نظم کرنے کی سعادت میسر ہوگئی۔

یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ زخمی کی ذہنی پرورش لکھنؤ کے شیعہ ماحول میں ہوئی جو سلطنت اودھ کے بانی برہان الملک سید محمد امین (۱۶۹۰ءتا۱۷۳۹ء) کے عہد حکومت سے ہی ایران کے دور صفوی (۹۰۸ھ تا ۱۱۴۹ھ/۱۵۲۱ءتا۱۷۳۶ء) کی روایات سے عبارت تھا۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ زخمی نے مقامی مجالس عزا سے استفادہ کے علاوہ دینی و مسلکی کتب سے بھی استفادہ کیا اور پایان کار منقبت علی کرم اللہ وجہہ کے مضامین کو اپنے ہفت بند میں بہتات سے جگہ دی۔

زخمی کے ہفت بند میں تعداد اشعار ۶۷ ہے اور بعض اشعار میں مناقب کی تعداد ایک سے زیادہ ہے جو آیات قرآنی، احادیث محمد رسول اللہ علیہ وسلم اور اقوال علی کرم اللہ وجہہ پر مشتمل ہیں اور جن کو متعلقہ کتب سے مربوط کرنا دشوار و صبر آزما ثابت ہوا۔ اگر ان جملہ مناقب کو ترجمہ و تفسیر کے ساتھ یکجا کیا جائے تو ایک ایسا رسالہ مرتب ہوسکتا ہے جو زخمی کی وسعت معلومات اور قوت شعر گوئی کا شائستہ نمونہ ہوگا۔

آیات قرآنی سے فضائل علی کرم اللہ وجہہ کے استنباط میں عمدۃ البیان فی تفسیر القرآن سے رجوع کرنا مناسب معلوم ہوا کیونکہ وہ ایک شیعہ عالم کی تحریر کردہ ہے، سردست طوالت کلام سے گریز کے پیش نظر حدیث رسولؐ و قول علیؓ پر ہی حصر کرنا پڑا جس کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

بہر تو صد یار منی گفتہ خیر المرسلین صد شرف از منکما روح الامیں دریافتہ (بند۳-شعر۹)

معرکہ احد میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی کمال بہادری پر حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ علیؓ مرتضیٰ نے آپ کے ساتھ کمال بہادری و جواں مردی دکھائی تو اس پر حضورؐ نے فرمایا انہ منی و انا منہ (بلاشبہ یہ میرے ہیں اور میں ان کا ہوں)، حضورؐ نے یہ کلمہ ارشاد فرمایا تو جبریلؑ نے عرض کیا وانا منکما (اور میں تم دونوں کا ہوں)

بیان کرتے ہیں کہ غیب سے ایک آواز سنی لا فتی الا علیؓ لا سیف الا ذو الفقار (کوئی جواں مرد نہیں بجز علیؓ کے اور کوئی تلوار نہیں بجز دوالفقار کے)۔(مدارج النبوت، ج ۲، ص ۲۱۱)

موسیٰ طور تجلی شاہ ہارون منزلت عیسیٰ گردوں رفعت رافع اعلام دیں

امـا ترضی ان تکون منی بمنزلة ہـاروںؑ مـن موسیٰ الا انه لا نبوة بعدی — کیا آپ اس بات سے راضی نہیں کہ میرے نزدیک تمہارا وہ مقام و مرتبہ ہو جو ہارونؑ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک تھا مگر میرے بعد نبوت نہیں۔ (خلفائے رسول، ص ۱۷۱)

صاحب سر سلونی راز دار لوکشف صدر دیوان کرامت مصطفےٰ راجانشیں (بند-شعر ۱۱)

یہ حوالہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک خطبے کی عبارت کا ہے۔

ایهـا الـنـاس سـلـونـی قبـل ان تغقدنی — اے لوگو! مجھے کھو دینے سے پہلے مجھ سے پوچھ لو۔(نہج البلاغہ، ج ۲، ص ۵۰۴)

(۴)

ہفت بند اور بند میں طبع آزمائی کرنے والے عہد گزشتہ کے شعراء اس وقت سکہ رائج الوقت نہیں ہیں، حالانکہ وہ خالص سیم و زر ہیں اور ان کی بازیافت سے ایک علمی و ادبی عہد کی نشاندہی ہوتی ہے جس کو وسیلۂ تحقیق سے متعارف کرانا خالی از افادہ نہیں ہوگا۔

اشاریہ

(۱) نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان، ص ۱۲۸، ۱۲۹۔ (۲) ایضاً، ص ۱۳۵۔ (۳) ریاض الفصحاء، ص ۱۱۵۔ (۴) یوگدان، ص ۱۳۴۔ (۵) نام قمر الدین احمد خاں، تخلص قمرؔ عرف مرزا حاجی، شاگرد مرزا محمد حسن قتیل، رک۔ ریاض الفصحاء، ص ۲۵۹، ۲۶۰۔ (۶) ریاض الفصحاء، ص ۱۱۵۔ (۷) ایضاً۔ (۸) ایضاً، مرزا محمد حسن قتیل کی تاریخ وفات ۳۱/جنوری ۱۸۱۸ء ہے۔ رک۔ وفیات مشاہیر اردو، ص ۴۸۶۔ (۹) ایضاً۔ (۱۰) صبح گلشن، ص ۱۸۹۔ (۱۱) یوگدان، ص ۱۲۹۔ (۱۲) ایضاً۔ (۱۳) ایضاً، ص ۱۶۷۔ (۱۴) صبح گلشن، ص ۱۸۹۔ (۱۵) ایضاً۔ (۱۶) یوگدان، ص ۱۲۹۔ (۱۷) سری واستو نے یوگدان میں باردگر زخمی کی انتقال کے وقت عمر ۶۵ سال بتائی (ص ۱۶۷)۔ یہ تاریخ بھی غلط ہے، زخمی کی وفات کے وقت عمر باعتبار سن عیسوی ۶۸ سال کی تھی۔ (۱۸) مکتوب ڈاکٹر سید مسعود حسن از

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ (بہار) مورخہ ۱۴/اگست ۲۰۱۰ء بنام راقم الحروف۔(۱۹) از سہ ماہی مصنف علی گڑھ بابت مارچ ۱۹۴۶ء، ص ۱۱۱ تا ۱۱۶۔(۲۰) مکتوب نمبر شمار ۱۸ پر مورخہ ۱۴/اگست ۲۰۱۰ء۔(۲۱) فغانی شیرازی، متوفی ۹۲۵ھ مطابق ۱۵۱۹ء۔(۲۲) استاذی جناب مولوی محمد محسن قریشی دیوبندی متوفی ۲۸/مئی ۱۹۹۰ء۔(۲۳) یوگدان، ص ۱۰۵۔(۲۴) رامپور رضا لائبریری رامپور (یوپی) کے سینئر ریسرچ فیلو ڈاکٹر اطہر مسعود خاں کی عنایت سے "ہفت کوکب" کی نقل حاصل ہوئی اور اس کے بالاستیعاب مطالعے کا موقع ملا جس کے لیے راقم الحروف ان کا ممنون ہے۔(۲۵) شعر الہند، ج ۲، ص ۳۳۰۔(۲۶) حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے مدارج النبوت میں حضرت سلمانؓ فارسی کے حالات تفصیل سے درج کیے ہیں (ج ۲، ص ۸۸۶ تا ۸۸۸)، جن کے مطابق مجملاً حضرت سلمانؓ فارسی النسل ہرمز کے رہنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر اصحاب میں سے ہیں جن کے متعلق حضور اکرمؐ نے فرمایا تھا "سلمانؓ منا اھل البیت" (سلمانؓ میرے اہل بیت سے ہیں) وہ عظیم الجثہ شخص تھے۔ ان کی صرف ایک عبا تھی اسی کو وہ پہنتے اسی کو وہ اوڑھتے تھے اور کسی درخت یا دیوار کے سائے میں سوتے تھے، نہ گھر تھا اور نہ رہنے کی جگہ، ان کا پہلا غزوہ خندق ہے اور خندق ان کے رائے مشورے سے بنائی گئی تھی۔ (۲۷) زخمی نے ارمیہ لیکن کوکب دری فی فضائل علیؓ میں یہ ارژنہ ہے، ص ۲۶۳۔(۲۸) نہج البلاغہ، ج ۲، ص ۵۵۴، نیز خلفائے رسولؐ، ص ۱۸۷، نیز عمدۃ البیان فی تفسیر القرآن، ج ۱، ص ۳۰۹۔(۲۹) غیاث اللغات، ص ۵۱۶۔ (۳۰) کوکب دری فی فضائل علی کرم اللہ وجہہ، ص ۲۶۳، ۲۶۴۔

کتابیات

الطاف علی، سید، بریلوی، مدیر سہ ماہی مصنف علی گڑھ، شمارہ مارچ ۱۹۴۶ء، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ۔

جوہر دیوبندی، بدھ پرکاش گپتا، موج گنگ، تذکرہ شعرائے ہنو محبوب پریس دیوبند، ۱۹۸۳۔

خضر حسین، مولانا، سید چشتی، خلفائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، نام مطبع اور تاریخ طباعت ندارد۔ فاروقیہ بک ڈپو، دیپا سرائے، سنبھل یوپی۔

راقم، حیدر حسین صدیقی بریلوی ہفت کوکب، مطبع روہیل کھنڈ بریلی، ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء۔

عبدالسلام ندوی، مولانا، شعر الہند، حصہ دوم، مطبع معارف اعظم گڑھ، تاریخ طباعت ندارد۔

علی حسن خاں، نواب، سید، تذکرہ صبح گلشن (فارسی)، مطبع شاہجہانی، بھوپال ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء۔

عبدالحق، شیخ، علامہ، محدث دہلوی، مدارج النبوۃ، دو حصے، اردو ترجمہ، مترجم مفتی غلام الدین نعیمی، نرمان پریس دہلی ۶، ۲۰۰۴ء۔

شریف رضی، علامہ، نہج البلاغہ (اردو ترجمہ) مترجم علامہ مفتی جعفر حسین صاحب، نظامی آفسیٹ پریس لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۹۸ء۔

غیاث الدین، محمد، رامپوری، غیاث اللغات، مطبع حسنی لکھنؤ، ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء۔
مصحفی، غلام ہمدانی، ریاض الفصحاء (فارسی)، مرتبہ مولوی عبدالحق، جامع برقی پریس دہلی، ۱۹۳۴ء۔
محمد صالح کشفی، مناقب مرتضوی مترجم سید محمد سبطین، عباس بک ایجنسی، درگاہ حضرت عباس، رستم نگر، لکھنؤ۔
نریندر بہادر سری واستو، ڈاکٹر، نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان، ناظم پریس رامپور، اکتوبر ۱۹۷۹ء۔
عمار علی، سید، سونی پتی، عمدۃ البیان فی تفسیر القرآن، تین حصے، مطبع یوسفی دہلی، ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۳ء۔

امدادی کتب

القرآن الکریم ترجمہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن، تفسیر شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، پرنٹنگ کمپلیکس مدینہ منورہ، ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۳ء۔
صحیح بخاری شریف عکسی مترجم، ترجمہ مولانا عبدالحکیم خاں اختر شاہ جہاں پوری، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئیوالان دہلی، ج ۲، نام مطبع اور تاریخ طباعت ندارد۔
قاموس القرآن، زین العابدین سجاد میرٹھی، قاضی، محبوب پریس دیوبند، ۱۹۸۶ء۔
خمسہ ہفت بند ملا کاشی، سالک، نواب سید احمد خاں، ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء، مطبوعہ در مطبع شعلہ کانپور۔
وفیات مشاہیر اردو، بشارت علی خاں فروغ رامپوری، مکتبہ الحسنات ۲۲۴۱، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء۔
تاریخ روہیل کھنڈ، عبدالعزیز خاں عاصی بریلوی، رشید آرٹ پریس میکلوڈ پریس، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۷ء۔

حرف آخر:

راقم الحروف کی جن افراد نے کسی نہ کسی ذریعہ سے کتابوں اور معلومات کی فراہمی میں مدد کی، ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

۱- جناب اسلم محمود، A-885 اندرا نگر، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۶۔ ۲- ڈاکٹر سید مسعود حسن، انچارج Acqinsition Section خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۸۰۰۰۰۴۔ ۳- ڈاکٹر شمس بدایونی، ۵۸ آزاد پورم کالونی، چھاؤنی اشرف خاں، ہارٹ مین کالج روڈ، عزت نگر، ۲۴۳۰۲۲۔ ۴- ڈاکٹر اطہر مسعود خاں سینئر ریسرچ فیلو، رامپور رضا لائبریری رامپور (یوپی) ۲۴۴۹۰۱۔ ۵- سید فرحت حسین زیدی، باقر منزل، گڈھیا، ڈاک خانہ قلعہ بریلی، ۲۴۳۰۰۳۔

تاریخ القرآن وغرائب رسمه وحکمه
کا ایک مطالعہ

کلیم صفات اصلاحی

''تاریخ القرآن وغرائب رسمه وحکمه'' کاتب مصحف المملکۃ المکرمۃ محمد طاہر بن عبدالقادر الکردی المکی الشافعی کی گراں قدر تصنیف ہے، ان کی ولادت ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء میں مکہ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم مدرسۃ الفلاح میں حاصل کی، ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء میں فراغت کے بعد ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جامعہ ازہر میں داخلہ لیا، وہاں سات برس تک تحصیل علم میں مصروف رہے، عربی اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ فن خطاطی سے بھی شغف پیدا کیا اور اس فن میں اس قدر مہارت حاصل کرلی کہ ''خطاط'' کے لقب سے مشہور ہوئے اور کاتب مصحف مکہ مکرمہ کے اعزاز سے بھی سرفراز ہوئے۔ جامعہ ازہر کے مشہور اساتذہ فن شیخ محمد نجیت المطیعی، شیخ یوسف الدجوی، شیخ عبدالفتاح الطلاوی اور شیخ محمد حبیب اللہ الشنقیطی رحمہم اللہ وغیرہ سے اکتساب علم کیا، خود بھی درس وتدریس کا شغل اختیار کیا اور تلامذہ کی ایک کثیر تعداد چھوڑی، محکمۂ شرعیۃ الکبریٰ، مکہ، مدرسۃ الفلاح، مکہ مکرمہ، مدرسۃ السعودیۃ، مکہ، عزیزیہ ابتدائیہ، لجنۃ التنفیذیہ لتوسعۃ وعمارۃ المسجد الحرام، مکتب مشروع التوسعۃ کے شعبۂ تالیف وآثار تاریخیہ وغیرہ کی تعلیمی، تدریسی، علمی، تحقیقی اور دینی سرگرمیوں میں مختلف حیثیتوں سے خدمات انجام دیں۔ مختلف موضوعات پر تقریباً چالیس کتابیں یادگار چھوڑیں۔ قرآن، تفسیر، حدیث، آثار، فقہ، ادب اور تاریخ سے ان کو خاص دلچسپی تھی، ان کی بلند پایہ تصنیفات کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کا علمی وتصنیفی ذوق تحقیقی تھا، کتابت قرآن کی پیشہ ورانہ خدمت کے باعث علوم قرآنی میں ان کا اشتغال وانہماک بہت بڑھ گیا تھا چنانچہ تاریخ القرآن کے علاوہ التفسیر المکی، زھرۃ التفاسیر، المقارنہ

بین الخط المصحف العثمانی و اصطلاحنا فی الاملاء وغیرہ منظر عام پر آئیں، **تاریخ الخط العربی و آدابه**، **رساله فی الدفاع عن الکتابة**، **کراسة الحرمین فی تعلیم خط الرقعة** (۷جزء)، **الهندسة المدرسیة**، **مجموعة الحرمین فی تعلیم خط النسخ**، **لوحات فی الخطوط العربیة** اور **نفحة الحرمین فی تعلیم خطی النسخ و الثلث** وغیرہ تصنیف کرکے فن کتابت کی تعلیم وتوسیع میں اہم خدمات انجام دیں۔۲۳/ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۱ء بروز دوشنبہ جدہ میں وفات پائی، ان کے داماد ادد-عبدالوہاب سلیمان کا بیان ہے کہ مرحوم پاکیزہ نفس، شریف الطبع اور فیاض تھے البتہ مزاج میں کسی قدر حدت تھی۔(۱)

مصنف کا عزم کتابتِ قرآن: کتابتِ قرآن کا جب انہوں نے ارادہ کیا اور کچھ اجزا لکھ لیے تو اپنے دوست شیخ محمد سرور سے کہا کہ مکمل ہونے کے بعد میں اس کو شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔انہوں نے جواب دیا کہ اچھا خیال ہے، ممکن ہے اس سے خوش ہوکر وہ تمہیں کسی منصب سے سرفراز کردیں یا اس کے بدلے کچھ اور معاوضہ دے دیں اور تمہارے مصحف کو شاہی خزانہ میں محفوظ بھی کردیا جائے، اس کے بجائے کیوں نہ ایک کمپنی سے جس نے نیا نیا پریس قائم کیا ہے معاہدہ کرلیا جائے جو اس کو چھاپے اور اسے عام لوگوں تک پہنچا دے، چنانچہ اس رائے سے شیخ طاہر نے اتفاق کیا اور کمپنی کے مالک محمد علی مغربی سے ملاقات کرکے طے ہوا کہ کمپنی اس کو طبع کرائے گی، معاہدے میں یہ بات بھی تھی کہ کتابت مصحف عثمانی کے رسم خط کے مطابق ہوگی، کتابت تین سال میں مکمل ہوئی اور حکومت کے سامنے اس کو نظر ثانی اور تصحیح کے لیے پیش کردیا گیا، حکومت نے باقاعدہ اس کے لیے شیخ عبدالظاہر امام حرم شیخ صالح لبید محمد شطا اور سید ابراہیم نوری وغیرہ پر مشتمل کمیٹی بنائی، اس کے فیصلہ کے بعد کمپنی نے اسے شائع کیا اور اس کو یہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ مکہ مکرمہ ہی نہیں پورے عالم اسلام میں اس کی اشاعت ہوئی۔ان کے تحریر کردہ نسخے نہ صرف مکہ و مدینہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں بلکہ سرکاری مہمانوں اور دنیا سے آنے والے بڑے بڑے وزرا اور زائرین کی خدمت میں انہی کے تحریر کردہ مصاحف بطور تحفہ پیش کیے جاتے ہیں۔(۲)

وجہ تالیف: اس کتاب کی وجہ تالیف کے سلسلہ میں مصنف کا بیان ہے کہ اصلاً یہ مصحف

کی کتابت کا فیض ہے، جب ہم نے مصحف لکھنا شروع کیا اور پانچویں پارہ تک پہنچے تو خود مصحف عثمانی میں رسم خط کے عجیب وغریب اختلافات دیکھے، چوں کہ معاہدہ میں رسم خط مصحف عثمانی کی اتباع کو ضروری قرار دیا گیا تھا اس لیے مصحف عثمانی کے ایک ایک لفظ کا ہم نے بغور مطالعہ کیا، اگر ہم ایسا نہ کرتے تو مصحف عثمانی کے رسم خط اور اپنے املائی قواعد کے درمیان وجہ اختلاف کو بھی نہ سمجھ پاتے، ہم تو صرف اتنا جانتے تھے کہ لفظ ''کتاب، ابراہیم، اسماعیل، ہارون وسلیمان'' وغیرہ مصحف میں بغیر الف کے لکھا ہوا ہے، اس کے علاوہ دوسری چیزوں پر ہماری نگاہ جاتی ہی نہیں کیوں کہ ہم صرف قرأت صحیحہ کے عادی ہیں، رسم خط میں اس صورت حال کی وجہ مصنف نے علم قرأت، فن تجوید اور فن رسم خط سے عدم واقفیت بتائی ہے اور لکھا ہے کہ مصر تنہا ایسا ملک ہے جس نے ان علوم کو محفوظ رکھا'' **والسبب فی عدم ملاحظتنا هيئة رسم الكلمات فی المصحف هو عدم الاعتناء بتعليم القراء ات وفن الرسم وعلم التجويد...... كانت مصر هی الوحيدة فی المحافظة علی هذا العلوم**''۔(۳)

اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ کیوں نہ اس موضوع پر ایک رسالہ تصنیف کیا جائے اور عام استفادہ کے لیے اس کو عالم اسلام میں پھیلایا جائے، اس طرح یہ کتاب سامنے آئی، اس میں اصول کتابت کے لحاظ سے باہم مختلف الہیئت تمام الفاظ کے استقصا کی کوشش کی گئی ہے، سوائے ان الفاظ کے جو کسی طرح ہماری فکر ونظر کی گرفت سے رہ گئے ہوں (۴) **واستقصينا جميع انواع الكلمات المخالفة لقواعد كتابنا: الاماشر وعن النظر وغاب عن الفكر** آگے لکھتے ہیں:

> ''حیرت ہوتی ہے جب اس بات پر نگاہ پڑتی ہے کہ مصحف عثمانی کے رسم خط میں کسی خاص اصول یا قاعدہ کی رعایت ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے، مثلاً لفظ ''کتــاب'' چار مقامات کے علاوہ ہر جگہ بغیر الف کے، لفظ ''ایهــا'' تین جگہوں کے علاوہ ہر جگہ الف کے ساتھ، لفظ ''ابراہیم'' سورۂ بقرہ میں ''ابـرٰهم'' اور پورے قرآن میں ''ابــراهيم''، اسی طرح لفظ ''يـاابن ام'' سورۂ طٰہٰ میں ''يَـبْنَؤُمَّ'' اور اعراف میں ''قــال ابن ام''، لفظ ''مــانشـاء'' سورۂ ہود میں

''مانشوٰٓا''اورسورۂ حج میں''مانشاء''اورلفظ''الامثال''،بعض جگہ''ث'' کے بعدالف اوربعض جگہ بغیرالف کے لکھا گیاہے،ان کے علاوہ ایسے الفاظ بھی ہیں جوایک جگہ ایک شکل میں اور دوسری جگہ الگ طریقہ سے لکھے گئے ہیں،اس اختلاف کے اسباب تو صحابہؓ ہی بتا سکتے تھے،کسی نے صحیح کہا ہے کہ جس طرح قرآن خوداپنی ذات میں معجزہ ہےاسی طرح اس کارسم الخط بھی معجزہ ہے، ولقد صدق من قال ''کما ان القراٰن معجز فی ذاتہ فخطہ معجز ایضاً''۔(۵)

موضوعات ومباحث: پوری کتاب ۲۵۵ صفحات پر مشتمل ہے،کل چھ ابواب ہیں،چوتھے اور پانچویں باب کے علاوہ ہر باب میں پانچ فصلیں ہیں،چوتھا ۲،اور پانچواں ۴ فصلوں میں منقسم ہے،کتاب کا دوسراایڈیشن ہمارے پیش نظر ہے،شروع میں طبع اول کا پانچ اورطبع ثانی کا دوصفحوں کا مقدمہ ہے،کتاب کے محتویات کامختصراًذکرمناسب ہوگا کیوں کہ اس میں تعریف قرآن،اس کے متعلقات،جمع وکتابت،ترتیب آیات وسور،ضبط وتصحیح،رسم خط،کیارسم خط توقیفی ہے؟اس کی اتباع کا شرعی حکم،نقطوں اوراعراب کا سبب،املاوکتابت سے صحابۂ کرام کی واقفیت،مصحف عثمانی کے رسم خط سے اپنے رسم خط کا موازنہ،اس اہم موضوع کے بنیادی مباحث اور دقیق مسائل سے بحث کی گئی ہے،آخر میں مکہ معظمہ کی تعمیر وتاسیس کے تاریخی ادوار پر مشتمل منظوم ضمیمہ بھی ہے، مستندترین تاریخی مصادر کی روشنی میں ہر دور کے تعمیری خصائص بھی تحریر کیے ہیں۔

اس ضمن میں مصنف کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

''ہم نے اس کتاب میں قرآن مجید کے تمام پہلوؤں پر بسط وتفصیل سے روشنی ڈالی ہے،ہاں ناسخ ومنسوخ،متعددقرأتوں کے اسباب،قرائے کرام کے سوانح وغیرہ پر گفتگو سے اس لیے پہلوتہی کی ہے کہ اس سلسلہ کا ہر موضوع مستقل بالذات فن اور الگ تصنیف کا متقاضی تھا،البتہ حسب ضرورت وضاحتی اورتشریحی فوائدضرورتحریرکردیے ہیں،کتاب میں کل چھ ابواب اور ہر باب کے تحت چندفصلیں ہیں،کتاب کا نام''تاریخ القرآن وغرائب رسمہ وحکمہ''رکھاہے''۔

کتاب کی انفرادیت: جہاں تک اس موضوع پر تحقیق و تصنیف کی بات ہے تو خود مصنف کا کہنا ہے کہ قدمانے اس سلسلہ میں جلیل القدر تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں (۶) **لقد الف علماء القراء ة المتقدمون فی رسم المصحف العثمانی مؤلفات جلیلة**۔ اردو زبان خود اس قسم کی کتابوں سے مالا مال ہے، مولانا اسلم جیراجپوری کی تاریخ القرآن اس سے بہت پہلے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوچکی تھی جس میں انہوں نے مصحف عثمانی کے رسم الخط وغیرہ پر قدما میں علامہ زمخشری اور سیوطی کے حوالہ سے اظہار خیال کیا تھا اور اس کی اتباع کی معنویت پر بھی روشنی ڈالی تھی۔

اسی طرح مولانا محمد علی مونگیری کے تلمیذ رشید مولانا مفتی عبداللطیف صاحب کی تصنیف اسی نام سے اسی سال منظر عام پر آئی تھی جس میں جمع و ترتیب قرآنی وغیرہ موضوعات کے ساتھ ساتھ مصحف عثمانی کی کتابت اور اس کے تاریخی مباحث پر محققانہ نگاہ ڈالی گئی تھی۔ خود دارالمصنّفین نے ۱۹۶۴ء میں جناب سید صدیق حسن صاحب کی تصنیف جمع و تدوین قرآن شائع کی، جس میں کتابت و رسم خط عثمانی پر مجملاً روشنی ڈالی گئی تھی لیکن "تاریخ القرآن وغرائب رسمہ وحکمہ" کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں مصحف عثمانی کے رسم الخط، کتابت قرآن میں اس کے اتباع کے شرعی احکام اور صحابہ کرامؓ کے اسلوب کتابت کا جس گہرائی و باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے اور ایک ہی لفظ مصحف میں کتنی بار کس انداز سے تحریر کیا گیا ہے، جس دقت نظر سے ان کا استقصا اور احاطہ کیا گیا ہے، دوسری کتابیں اس سے خالی ہیں، گولڈ زیہر اور نویلدیکی وغیرہ، علمائے اسلام کے برخلاف قرأت قرآن کو رسم الخط کے تابع قرار دیتے ہیں، اس کا جواب بھی دینے کی کوشش کی ہے، اسی طرح عام مستشرقین قرآن مجید کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف اور اس کا اصل ماخذ یہود و نصاریٰ سے آپؐ کی گفت و شنید کو تسلیم کرتے ہیں لیکن مصنف نے بعض ایسے مستشرقین کے خیالات بھی نقل کیے ہیں جو قرآن مجید کو خدا کا کلام تسلیم کرتے ہیں، اسی طرح اس کتاب میں قرآن کے پہلے مطبوعہ نسخے کی نشان دہی کی گئی ہے (۷) مصحف عثمانی کے رسم الخط کی اتباع کی معنویت پر بڑی گہرائی اور نئے انداز سے بحث کی گئی ہے، کتاب کی یہی منفرد نوعیت اس کے اس اجمالی تعارف کا اصل سبب ہے۔

مغرب کا انداز فکر یہ ہے کہ وہ اپنے علاوہ دنیا میں کسی بھی تہذیب اور تمدن کو پھلتا پھولتا دیکھنا نہیں چاہتا اور وہ جدید ذرائع ابلاغ کا سہارا لے کر پوری دنیا میں اپنی تہذیب کے نفاذ کی کوششوں میں بہت حد تک کامیاب بھی نظر آتا ہے، اب اس کی جانب سے انٹرنیٹ کی دنیا میں ایسی آوازیں آنا شروع ہوگئی ہیں کہ قوموں اور ملکوں کے جدا جدا رسم الخط کی ضرورت باقی نہیں، ایک ہی رسم الخط ہو جو پوری دنیا میں رائج ہو، اس غیر فطری آواز کو نقار خانہ میں طوطی کی آواز سمجھنے کے بجائے اس پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، بالخصوص قرآن مجید کے رسم الخط کی حفاظت، اس کی معنویت اور اس کے فروغ پر مغرب سے زیادہ عقلی اور سائنٹفک انداز سے غور وفکر ضروری ہے، یہ مذہبی فریضہ بھی ہے اور فطرت کا تقاضا بھی، ایسے حالات میں ''تاریخ القرآن وغرائب رسمہ و حکمہ'' جیسی کتابوں کے مطالعہ کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ کتاب میں کل چھ ابواب ہیں، پہلے دو ابواب میں علما کا قرآن سے اشتغال، قرآن کی تعریف، پہلا مطبوعہ قرآن، قرآن کے علوئے مرتبت کا اعتراف مستشرقین کی زبانی، اعجازِ قرآن کا معنی و مفہوم، نزول وحی کی کیفیت، جستہ جستہ نزول قرآن کی حکمت، عہد نبویؐ و صدیقی میں جمع قرآن، اس سلسلہ میں متعدد سوالات کے جوابات، غیر مصحف عثمانی کو نذر آتش کرنے کا سبب، حضرت ابوبکر و عثمان رضی اللہ عنہما کے جمع کردہ قرآن میں فرق، کتابت قرآن کے لیے حضرت زیدؓ کے انتخاب کی وجہ، صحابہ کرام کی احتیاط، مصحف کی ضبط و تصحیح، ترتیب آیات وسور، لکھنے پڑھنے میں آیتوں اور سورتوں کو آگے پیچھے کرنے کا حکم، طوال وقصار مفصل، سورتوں کے ناموں کا معاملہ، سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے یا اجتہادی، مصحف عثمانی کی تعداد، سات حرفوں میں نزول قرآن کا مسئلہ، اختلاف قرأت کے اسباب اور اس کے فوائد وغیرہ پر تفصیلی گفتگو ہے، ان تمام مباحث کا تعلق تاریخ قرآن سے ہے، تیسرا باب خاص مصحف عثمانی کے رسم الخط سے متعلق ہے، زیر نظر تحریر میں اسی باب سے خاص طور پر تعرض کیا گیا ہے۔

رسم خط مصحف عثمانی اور اس کے ضابطے: قرآن مجید کے اب تک کے دستیاب نسخوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جس میں رسم عثمانی کے علاوہ کسی دوسرے خط کی رعایت کی گئی ہو، اس کا ایک خاص رسم الخط ہے اور اسی کے مطابق بالالتزام نسخے لکھے جاتے ہیں، اس سے انحراف

درست نہیں حتیٰ کہ خلاف قاعدہ لکھے ہوئے الفاظ میں بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی اور صحابہ کرام کے مجوزہ رسم الخط کو باقی رکھنا اس امت نے اپنا فریضہ سمجھا، مصنف اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں اسی لیے انہوں نے مصحف کے رسم الخط کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ رسم الخط ہے جس کو صحابہ کرامؓ نے الفاظ قرآنی لکھتے وقت اختیار کیا تھا اور یہ ایک ایسے مخصوص ضابطہ کا پابند ہے جو متداول قواعد کتابت سے کہیں کہیں اتفاق نہیں کرتے، یہ رسم خط چھ قواعد حذف، زیادۃ، ہمزہ، بدل، وصل اور فصل پر منحصر ہے، مصنف نے شیخ محمد حبیب اللہ الشنقیطیؒ کی کتاب **ایقاظ الاعلام** سے اس کی مثالیں درج کی ہیں، حذف کی مثال میں **تعلمن مما علمت** میں ی، **الیل** اور **الذی** میں لام اور **بسم اللّٰہ** میں الف اور **یمح اللّٰہ الباطل** میں واو وغیرہ اور زیادہ کی مثال میں **لکنا ھو اللّٰہ ربی، بلقائی ربھم، لااذبحنہ** میں بالترتیب الف، ی اور الف کی زیادتی والی آیتیں پیش کی ہیں (۸) یہ قواعد حذف، زیادہ، وصل اور فصل وغیرہ موجودہ املائی قواعد کے لحاظ سے میل نہیں کھاتے، تاہم مصحف عثمانی ان ہی قواعد کا پابند ہے۔

مصنف کے بقول خود مصاحف عثمانی میں باہم اختلاف رسم الخط موجود ہے جس کی اتباع ضروری قرار دی جاتی ہے، مثال کے طور پر لفظ ''لدا'' کسی مصحف میں الف اور کسی میں ی سے لکھا ہے لیکن اس اختلاف رسم خط کے متعلق یہ رائے دی گئی ہے کہ یہ اختلاف حقیقی کے بجائے صوری ہے، اصلی اختلاف اس وقت کہا جاتا جب رسم الخط کے لحاظ سے پڑھنے میں مجوزہ قرأت سبعہ میں سے کسی ایک سے بھی اس کی الگ قرأت ہو جاتی۔(۹)

مصاحف عثمانی میں رسم خط کے اختلاف کا سبب: اس سلسلہ میں مصنف کا کہنا ہے کہ مصاحف عثمانی میں بعض لفظوں کے مختلف الرسم ہونے کی اصل وجہ ہم کو نہیں معلوم اور نہ ہی اس موضوع پر شیخ محمد حسنین مخلوف عدوی (۱۳۵۱ھ) کی کتاب ''عنوان البیان فی علوم التبیان'' کے علاوہ قدما و متاخرین میں سے کسی نے کچھ لکھا ہے، ان کے نزدیک رسم خط کا یہ اختلاف زبان کا اختلاف نہیں ہے جس سے معانی میں کوئی تبدیلی واقع ہو، ان کے مطابق مصاحف کے درمیان رسم خط کے یہ اختلافات ایک ہی زبان کے اندر مختلف انداز قرأت (ادائیگی تلفظ) ہونے کے سبب پائے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض نسخوں میں بعض الفاظ کسی شکل اور بعض میں دوسری

شکل میں لکھے گئے ہیں، اگر ہر نسخہ میں ایک ہی طریقہ سے لکھے جاتے تو سمجھا جاتا کہ یہ ایسے ہی نازل ہوئے ہیں اور اسی ایک کو اصل مان کر صحابہ کرامؓ کے دوسرے متفقہ نسخوں کے حاشیہ میں تصحیح کی ضرورت پیش آتی، اس لیے صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں جیسا لکھا تھا یعنی حرف قریش میں، بعد کے ادوار میں بھی اسی کی رعایت کی گئی، اسی وجہ سے کوئی فتنہ بھی نہیں کھڑا ہوا (۱۰) آخر میں لکھتے ہیں کہ جو شیخ عدوی کے اس جواب سے مطمئن نہیں تو وہ یہ سمجھ لے یہ ان رازوں میں سے ایک راز ہے جن کے حل کی ہدایت بڑے بڑے علما و عقلا کو نہیں دی گئی، ایسی صورت میں صرف ہم کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ (ص ۹۸)

کیا رسم خط توقیفی ہے؟: یہ مسئلہ کہ قرآن مجید کا رسم خط توقیفی یعنی اس کے علاوہ کسی دوسرے رسم خط میں قرآن مجید نہیں لکھا جاسکتا یا اس میں اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ دوسرے رسم خط میں قرآن مجید کی کتابت کی جاسکتی ہے، اس سلسلہ میں علما مختلف الرائے ہیں، بعض کہتے ہیں یہ صحابہ کرام کی اصطلاح یا ایجاد ہے، بعض کا خیال ہے کہ یہ توقیفی ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیلؑ کی ہدایت کے مطابق حضرت زیدؓ بن ثابت وغیرہ سے اس کا املا اپنی نگرانی میں کرایا اور جو لفظ آپ نے جیسے صحابہ کرامؓ سے لکھوایا آخر تک ویسے ہی امت میں محفوظ ہے، مثلاً لفظ ''واخشونی'' سورہ بقرہ میں ''ی'' اور سورۂ مائدہ میں دو جگہ بغیر ''ی'' کے لکھا گیا ہے، اس قسم کی بہت سی نظیریں موجود ہیں جن سے قرآن کے ہجائی اور اس کی کتابت کے توقیفی ہونے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ آپ کے عہد میں قرآن ایک جگہ مرتب صورت میں نہیں تھا۔ (۱۱)

لیکن مصنف مصحف عثمانی کے رسم خط کو توقیفی تسلیم نہیں کرتے، اس سلسلہ میں انہوں نے پانچ چیزوں کی جانب نشان دہی کی ہے جن کا خلاصہ ذیل میں پیش ہے:

پہلی دلیل آپ کا امی ہونا آپ کے معجزات میں سے ہے، ایک امی قواعد املا و کتابت سے کیوں کر واقف ہوسکتا ہے اور وہ ایک ہی لفظ مثلاً ابراہیم کو سورۂ بقرہ میں بغیر ''ی'' اور پورے قرآن میں ''ی'' کے ساتھ اور لفظ ''بِـاَیۡدٍ'' کو ایک جگہ دو اور ایک جگہ ایک ی، لفظ ''لشـایءٍ'' میں ش کے بعد الف کیوں کر لکھا جاسکتا ہے، اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت زیدؓ کو املا کرانے

کی یہی کیفیت بہ تواتر منقول ہے، جیسا کہ ہے نہیں تو رسم الخط کو توقیفی تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں، دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت زیدؓ اوران کے دوستوں میں لفظ تابوت کے سلسلہ میں اختلاف ہوا کہ اس کو ''ت'' یا ''ہ'' سے لکھا جائے تو حضرت عثمانؓ نے ''ت'' سے لکھنے کا حکم دیا، اگر رسم خط توقیفی ہوتا تو آپ حضرت زیدؓ کو ''ت'' سے لکھنے کا حکم نہ دیتے، تیسری دلیل مصاحف عثمانی میں اختلاف کتابت بھی نہ واقع ہونا، چوتھی دلیل حضرت امام مالکؒ قرآنی آیات کو مصحف عثمانی کے علاوہ دوسرے رسم الخط میں بچوں کو سکھانے کے لیے جواز کا فتویٰ نہ دیتے، پانچویں دلیل اس کو رسم عثمانی کے بجائے ''رسم توقیفی'' یا ''رسم نبویؐ'' سے منسوب کرتے۔

مذکورہ دلائل کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مصحف عثمانی کا رسم خط توقیفی نہیں صحابہ کرامؓ کا وضع کردہ ہے جس کی حکمت کا ادراک ہمارے لیے ممکن نہیں **فعلم مما ذکرناه ان رسم المصحف ليس توقيفيا انما هو من وضع الصحابة واصطلاحهم لحكمة لم ندركها۔** (۱۲)

قرأت اصل ہے رسم خط نہیں: بعض مستشرقین مثلاً گولڈزیہر (Ignaz Gold Ziher, 1850-1921) اور نویلدیکی (Theodor Noldeke, 1836-1930) وغیرہ رسم خط کو اصل اور قرأتوں کو اس کے تابع مانتے ہیں یعنی قرآن مجید رسم خط کے مطابق پڑھا جانا چاہیے کیونکہ قرآن پر اعراب اور نقطے وغیرہ بعد میں لگائے گئے ہیں عہد صحابہ میں ان کا وجود نہیں تھا، مصنف فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مستشرقین نے دین اسلام کے اہم اور دقیق مسائل میں غور وخوض کیا اور بعض نتائج کے تاریخی پہلوؤں پر ان کی رائے بھی درست قرار دی جاسکتی ہے لیکن دین کے وہ مباحث جن کی بنیاد عقل وفہم اور تصور کے بجائے قرآن وسنت پر رکھی گئی ہے، ان میں ان کے آرا نا قابل توجہ ہیں، اس لیے کہ وہ مباحث کتاب اللہ اور رسالت محمدیؐ پر ایمان اور صاحب زبان کی طرح عربی زبان و ادب پر دسترس کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتے، صحیح اور انصاف کی بات یہ ہے کہ اس کے لیے ہمیں علمائے اسلام کی جانب رجوع کرنا ہوگا، اگر اس سلسلہ میں ان کی رائے مان لی جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ صحابہ وتابعین نے رسم خط سے قرأت کا استنباط کیا ہے اور ایسی صورت میں تحریف وتبدیلی لازم آئے گی، جو ممکن نہیں، صحابہ کرامؓ

نے قرآن کے ایک ایک حرف کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر حاصل کیا ہے اور اس کی سات حرفوں میں قرأت بہ تواتر منقول ہے اور یہ تمام قرأتیں رسولؐ اللہ سے بالمشافہ ماخوذ ہیں، رسم مصحف سے مستخرج نہیں ہیں البتہ رسم مصحف قرأت پر مبنی ہے۔

اس مسئلہ میں اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو سورۂ فرقان کی تلاوت ایسے حرفوں (لہجوں) میں کرتے سنا جس کو وہ نہیں جانتے تھے، حضرت ابیؓ بن کعب نے مسجد میں دو شخصوں کو نماز میں سورۂ نحل کی تلاوت کو اپنی قرأت سے الگ سنا، یا ابن مسعودؓ کے ساتھ بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، یہ لوگ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے تو آپؐ نے ان قرأتوں کو صحیح قرار دیا اور فرمایا ''ان ھذا القراٰن علی سبعة احرف'' جب ان واقعات پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسم مصحف سے اخذ قرأت ممکن نہیں، دوسری چیز جب یہ بات طے ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نقطوں اور اعراب کا وجود ہی نہیں تھا تو آیتوں میں حاضر و غائب کے صیغوں کو کیوں کر سمجھا جا سکتا تھا، سوائے اس کے کہ وہ الفاظ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی حاضر کے صیغہ میں ادا ہو رہے ہیں یا غائب کے صیغہ میں، مثال کے طور پر قرآن میں ''ام تقولون'' الخ، یا ''وما اللہ بغافل عما یعملون'' میں اگر اعراب یا نقطہ نہیں لگا ہے تو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ یہ حاضر کا صیغہ ہے یا غائب کا، ظاہر ہے سن کر ہی معلوم ہوگا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرأت اصل ہے نہ کہ رسم، رسم مصحف پورا کا پورا قرأت کے تابع ہے، البتہ کبھی کبھی چند لفظوں میں قرأت رسم خط کے تابع ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر ''جبریل'' کے ''ج'' اور ''ب'' پر اگر اعراب نہیں لگا ہے یا ''ر'' کے بعد ہمزۂ مکسورہ ممدودہ نہیں بنا ہے، یا مثلاً ''میکائیل'' میں بغیر ''ہمزۂ مکسورہ غیر ممدودہ'' کے قرأت صحیح نہیں ہوگی، ایسی صورت میں قرأت رسم کے تابع ہو جائے گی (۱۳) ان دلائل کی روشنی میں مستشرقین کے نظریات کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔

رسم عثمانی کی اتباع کا شرعی حکم: یہ بحث بالعموم علوم قرآنی پر مشتمل کتابوں میں نظر نہیں آتی اور اگر کہیں ذکر ملتا بھی ہے تو بہت سرسری لیکن مصنف نے اس بحث پر محققانہ نگاہ ڈالی ہے کہ کتابت قرآن میں مصحف عثمانی کے رسم خط کی پیروی کا حکم کیا ہے، اس کی مصلحت کیا ہے، قدما نے اس کے متعلق کیا معلومات بہم پہنچائی ہیں، یہ بحث بھی اہم اور حفاظت قرآن کے نقطۂ

نظر سے ضروری اور جدید تقاضے کے مطابق ہے۔

جہاں تک اس کی اتباع کے وجوب کی بات ہے تو ائمۂ فقہ نے اس کے وجوب سے مکمل اتفاق کیا ہے، دلیل یہ ہے کہ تقریباً ۱۲ہزار صحابۂ کرامؓ اس رسم مصحف عثمانی پر متفق ہیں اور کسی سے بھی اس کی مخالفت وارد نہیں، اس لیے ہر مسلمان پر اس کی اقتدا لازم ہے، بیہقی شعب الایمان میں لکھتے ہیں کہ جو قرآن لکھے اس کو چاہیے کہ اس ہجاء (کتابت) کا لحاظ رکھے جس میں مصاحف اول اول تحریر کیے گئے ہیں، صحابۂ کرامؓ کی مخالفت نہ کرے اور نہ ہی ان میں کسی قسم کے ردو بدل کا اس کو اختیار ہے، اس لیے کہ جماعت صحابہ علم، زبان و دل اور امانت کے پاس ولحاظ میں متاخرین سے زیادہ حساس تھے۔(۱۴)

امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ کیا نئے املائی قاعدے کے مطابق قرآن کی کتابت درست ہے؟ انہوں نے کہا نہیں، پھر فرماتے ہیں علمائے امت میں سے کسی سے اس کی مخالفت وارد نہیں ہے، امام احمدؒ فرماتے ہیں ''واو، الف'' یا ''ی'' وغیرہ کسی میں بھی مصحف عثمانی کے رسم خط کی مخالفت حرام ہے، جعبری وغیرہ سے منقول ہے اس کی اتباع کے وجوب پر ائمۂ اربعہ کا اتفاق ہے۔(۱۵)

قاضی عیاض کتاب الشفا کے آخر میں لکھتے ہیں کہ جان بوجھ کر کسی حرف میں کمی یا زیادتی کرنے یا کسی حرف کو اس کے علاوہ کسی ایسی جگہ لکھ دینے والا کافر ہے جس کا ثبوت صحابہ کرامؓ کے متفقہ مصحف سے نہ ملتا ہو(۱۶) شیخ عبدالرحمٰن بن قاضی مغربی مصحف عثمانی کے رسم خط کی مخالفت کو ناجائز اور اس کے خلاف کسی بھی دلیل و توجیہ کو ناقابل اعتنا سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جس نے امت کے اس متفق علیہ مسئلہ اور اس کے شرعی حکم کی خلاف ورزی یا کسی بھی قسم کی تعلیل کی تو اس پر گزشتہ اجماع امت کی مخالفت کا حکم جاری ہوگا اور اس کی تردید کی جائے گی (۱۷) ''**نہایت القول المفید فی علم التجوید**'' میں ہے کہ ائمہ قرأت و اہل ادا نے رسم مصحف عثمانی کی اتباع کو لازم قرار دیا ہے۔(۱۸)

مصحف ابوبکرؓ کی اتباع کیوں واجب نہیں: مصحف عثمانی سے قبل حضرت ابوبکرؓ نے مصحف تیار کیا تھا تو آخر امت نے اس کے اس رسم خط کی اتباع کو ضروری کیوں قرار نہیں دیا، مصنف نے اس سوال کا جواب بھی محققانہ طور پر دینے کی کوشش کی ہے، فرماتے ہیں کہ مصحف ابی بکرؓ

تمام لہجوں یعنی سات حرفوں میں لکھا گیا تھا اور ہر لہجہ کی کتابت کی تعیین کسی واضح علامت (رسم) سے کرنا ضروری تھا تاکہ دوسرے لہجہ کی قرأت گڈمڈ نہ ہو، دوسرے حضرت ابوبکرؓ نے اس کی اتباع کو لوگوں پر واجب بھی نہیں قرار دیا تھا، ان کے زمانہ میں صحابہ ساتوں قرأتوں (لہجوں) میں پڑھتے تھے، ان کا جمع وتحریر کردہ مصحف ان کے اپنے پاس محفوظ تھا (عام نہیں تھا) ان کے بعد حضرت عمرؓ اور پھر حضرت حفصہؓ کے پاس آیا، جب حضرت حفصہؓ کا انتقال ہوا تو ان کے ساتھ یہ مصحف بھی دھل دیا گیا اور اس کا کوئی نشان بھی باقی نہیں رہا، رہا مصحف عثمانؓ تو یہ صحف ابی بکرؓ ہی سے لکھا گیا تھا، اس کی کتابت میں بس ایک لہجہ یعنی لہجۂ قریش کی رعایت کی گئی اور بقیہ چھ لہجوں کو حضرت عثمانؓ نے اس لیے ترک کر دیا کہ لوگوں میں اختلاف قرأت نہ پھیلے، اسی مصلحت کے پیش نظر اپنے علاوہ تمام مصاحف کو انہوں نے نذر آتش کرنے کا حکم دے دیا، صحابۂ کرامؓ نے اس نیک عمل کی تائید وموافقت کی، چنانچہ اس کی ترتیب اور رسم الخط کی اتباع امت پر واجب قرار پائی (۱۹) اور مصحف ابوبکرؓ کی اتباع کو واجب نہیں کیا گیا۔

اس کی اتباع کے فوائد: رسم عثمانی کی اتباع کے متعدد فوائد میں ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ لوگ مصاحف کی اولین کتابت کی کیفیت سے واقف ہوئے، دوسرے اس سے بعض قبائل کی فصاحت زبان کا ثبوت بھی بہم پہنچایا، مثلاً ''ہا تانیث''، ''تا'' کے لیے قبیلۂ طے میں استعمال کی جاتی ہے اور ''**یوم یأت لا تکلم نفس**'' میں ''یای محذوف'' قبیلۂ ہذیل کی زبان کے مطابق ہے، اس کی اتباع کے فوائد میں ایک خط میں لکھے ہوئے لفظ سے مختلف قرأتوں کا اخذ بھی ہے، مثلاً ''**وما یخدعون الا انفسھم**'' میں ''**وما یخدعون**'' کو اگر ''**وما یخادعون**'' لکھ دیا گیا ہوتا تو ''**وما یخدعون**'' کی قرأت فوت ہو جاتی، اسی طرح بعض جملوں میں قطع ووصل کا معنوی فائدہ رسم عثمانی کی اتباع سے حاصل ہوا، مثلاً ''**ا م من یکون علیھم و کیلا**'' میں اگر ''ام'' کو ''من'' سے الگ کر دیا جائے تو بل کا معنی دے گا جو وصل سے حاصل نہیں ہوتا (۲۰)

منھا افادۃ المعانی بالقطع والوصل فی بعض الکلمات نحو (ام من یکون علیھم و کیلا) فان قطع ام عن من یفید معنی بل دون وصلھا بھا۔

صحابۂ کرامؓ کا اصول وقواعد کتابت سے واقف ہونا: بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ

صحابۂ کرامؓ اصول املا اور قواعد کتابت سے نا آشنا تھے اور دلیل میں مصحف عثمانی کے رسم خط کو پیش بھی کرتے ہیں یہاں تک کہ ابن خلدون جیسا مؤرخ بھی لکھتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے فن کتابت کے سلسلہ میں ہم تک جو معلومات پہنچی ہیں ان کی روشنی میں یہی بات کہی جاسکتی ہے کہ چوں کہ ان کے عہد میں یہ فن رائج نہیں تھا اس لیے اس کے اصول وضوابط سے ان کی نا آشنائی کا خیال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

اس کے برخلاف صاحب روح المعانی علامہ آلوسی نے صاف طور پر لکھا ہے کہ صحابۂ کرامؓ فن رسم خط کے اصول سے اچھی طرح واقف تھے، انہیں معلوم تھا کہ کون سا لفظ کہاں لکھا جائے گا اور کہاں فصل ہوگا اور کہاں وصل، قرآن مجید کے رسم خط میں بعض جگہوں پر جو خلاف قواعد چیزیں نظر آتی ہیں ان میں یہی حکمت پیش نظر ہے (۲۱) دوسرے صحابۂ کرامؓ نے ملوک وامرا سے مراسلت کی اور باہم عہد نامے مرتب کیے ہیں، اگر یہ مراسلتیں اور عہد نامے اصول کتابت کے مطابق نہ ہوتے تو صحابۂ کرامؓ اور ان کے درمیان التباس مطلب واقع ہوجاتا، کتابت کے مختلف ہونے سے معانی ومطالب میں بھی اختلاف ہوجاتا ہے، حرکتوں کی ایجاد سے قبل عمر اور عمرو ناموں میں ''واؤ'' کے ذریعہ فرق کرنا خود صحابۂ کرامؓ کی اس فن سے واقفیت کی واضح دلیل ہے، دونوں میں ''واؤ'' کے ذریعہ فرق انہوں نے التباس واشتباہ سے بچنے ہی کے لیے تو کیا تھا، پھر کہتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ کے بہت سے مراسلے اور خطوط مصر کے دارالکتب العربیہ میں اب تک محفوظ ہیں جو پتھروں، چمڑوں اور بردی اوراق پر کندہ ہیں، ہم نے خود ان کا مشاہدہ کیا اور ان کو پڑھا مگر ایک بھی املا اور کتابت کی غلطی نہیں پائی **وقد شاهدنا بانفسنا......وقرأناها فلم يجد فيها خطأ املائيا ولا غلطة كتابية** (۲۲) دورنہ جایئے خود حجاز، بالخصوص مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ اور طائف کی چٹانوں اور پتھروں میں صحابۂ کرامؓ کی کتنی تحریریں آج بھی موجود ہیں، جب ہم ان جگہوں پر گئے تو ان کے حسن خط، صحت کتابت اور تحقیق حروف پر ہمیں حیرت ہوئی جو خط کوفی کی متعدد قسموں میں لکھے گئے ہیں (۲۳) بحث کے آخر میں لکھتے ہیں کہ کیا ان دلائل کی موجودگی میں صحابۂ کرامؓ کی جانب اصول املا وقواعد کتابت سے ناواقفیت کی نسبت کی جاسکتی ہے (۲۴) **فهل بعد هذه الادلة تنسب الى الصحابة الجهل بقواعد الكتابة والاملاء۔**

اسی طرح موجودہ مانوس ورائج قواعد کتابت کے مطابق قرآن لکھنے کے نقصانات اور رسم عثمانی کے مطابق لکھنے کے فوائد کا احاطہ، مصحف عثمانی میں ایک ہی لفظ ایک جگہ دوسری شکل پر مشتمل الفاظ کا جدول بھی ہے (۲۵) اعراب اور نقطوں کا اختراع بہت بعد میں ہوا اس کے باوجود صحابہ کرامؓ اپنی سلامت روی اور سلیم الطبعی کی بنا پر قرآن کریم کی تلاوت بالکل صحیح کرتے تھے لیکن جب عرب وعجم کا اختلاط ہوا تو قرأت صحیحہ کے لیے نقطوں اور علامتوں اور اعراب وغیرہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔(۲۶)

غیر عربی میں قرآن کی کتابت وتلاوت ناجائز ہے: قرآن کی کتابت، تلاوت اور اس کا حرفی ترجمہ غیر عربی میں علما کے متفقہ فیصلہ کے مطابق جائز نہیں کیوں کہ اس سے قرآن کی تحریف وتبدیلی لازم آئے گی، البتہ اس کا تفسیری ترجمہ جس میں قرآن کے معانی کی تشریح اور اس کے اسرار کی وضاحت مقصود ہو درست ہے، خاص اس موضوع پر جلیل القدر تصنیفات موجود ہیں، مصنف کے مطابق غیر عربی میں قرآن کی حرفی کتابت وترجمہ ممکن ہی نہیں کیوں کہ غیر عربی زبانوں کے حروف کے مخارج عربی حروف کے مخارج سے بالکل الگ ہوتے ہیں اور حروف کی تعداد بھی کم وبیش ہے، فرض کرو اگر ترجمہ ہو بھی گیا تو بھی اس کو قرآن نہیں کہا جاسکتا، اس لیے کہ علمائے اصولیین قرآن کی درج ذیل تعریف پر متفق ہیں:

> ''**القراٰن هو الکتاب المنزل علی سیدنا محمد صلی اللّٰه علیه وسلم باللفظ العربی المنقول بالتواتر المبدوء بسورةالفاتحة المختوم بسورة الناس** یعنی قرآن وہ کتاب ہے جو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عربی میں نازل کی گئی اور یہ الفاظ بہ تواتر منقول ہیں جس کا آغاز سورۂ فاتحہ سے اور اختتام سورۂ ناس پر ہوتا ہے''۔

اسی طرح نادر قرأت بھی جو بہ تواتر منقول نہ ہو قرآن سے خارج ہے، مثلاً حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی قرأت ''**فان فاؤوا فیهن فان اللّٰه غفور رحیم**'' اور ''**وعلی الوارث ذی الرحم المحرر مثل ذالک**'' اور کفارہ کے سلسلہ میں درج ذیل قرأت ''**فمن لم یجد فصیام ثلاثة ایام متتابعات**'' (۲۷) وغیرہ خارج قرآن ہیں۔

مستشرق ر۔ف، بوڈلی بھی غیر عربی میں قرآن کی کتابت و قرأت کو صحیح نہیں سمجھتا، لکھتا ہے:

> ''قرآن کو (حرفی) ترجموں سے قیاس کیا جاتا ہے، حالاں کہ دونوں اپنے اپنے طرز ادا میں یکساں نہیں ہیں، قرآن کا بیشتر حصہ اپنے طریقۂ تعبیر، طریقۂ القا (نزول) اور اپنے موضوع سے مربوط ہے (اگر اس کا حرفی ترجمہ کیا گیا) تو وہ اپنی خوبصورتی کا بیشتر حصہ کھودے گا جس طرح سے الزبیتھ کے زمانہ میں انگریزی میں کی گئی انجیل مقدس نے اپنی خوبصورتی کھودی، قرآن جس وزن پر اللہ کی جانب سے اتارا گیا ہے اگر اس کو عربی سے دور یعنی غیر عربی قالب میں کیا گیا تو وہ وزن قرآن کھودے گا اور شاہ جیمس کے ترجمہ کے علاوہ توراۃ کے دوسرے ترجموں کا جو حشر ہوا وہی قرآن کا بھی ہوگا، فرانسیسی، جرمنی اور انگریزی قرآن کو اس دلکش اور جاذب آواز میں منتقل بھی نہیں کیا جاسکتا جس میں عربی قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے''۔(۲۸)

آخر میں لکھتے ہیں کہ جس طرح قرآن مصحف عثمانی کے علاوہ کسی دوسرے خط میں نہیں لکھا جاسکتا اسی طرح علما کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ قرآن مجید کی غیر عربی زبان میں تلاوت و کتابت نہیں کی جاسکتی۔(۲۹)

یہ اور اس طرح کے موضوعات جن کا تعلق کتابت و لہجۂ قرآن اور اس کے احکام سے ہے مصنف نے بڑی محققانہ اور فکر انگیز گفتگو کی ہے، جہاں تک قرآن کے تاریخی موضوعات یعنی جمع و تدوین، ترتیب آیات و سور، وحی کی کیفیت، سات حرفوں میں نزول قرآن کا مسئلہ، مصحف ابی بکرؓ اور مصاحف عثمانی کے علاوہ تمام نسخوں کو جلائے جانے کے واقعات کا تعلق ہے، ان کے مطالعہ سے بازخوانی کا احساس ہوتا ہے، البتہ مستشرقین کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ قرآن مجید کو کلام الٰہی نہیں مانتے، اس سلسلہ میں گولڈزیہر، نویلدیکی، ایڈورڈ جونسز، لوئس چارڈیہ، ولیم میور، روزویل اور لوئی مائی سین کے نام لیے جاسکتے ہیں اور اسی بنیاد پر اس کے زبان و بیان، اسلوب، حروف مقطعات پر اعتراض اور اس کی اس انفرادیت کو ختم کرنے کے لیے طرح طرح

کے بے سروپا الزامات اس پر عائد کرتے ہیں لیکن مصنف نے بعض مستشرقین کے حوالہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ وہ قرآن مجید کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف کے بجائے رب العالمین کا کلام تصور کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شومبش کے نزدیک قرآن کلام الٰہی ہے: جرمن مستشرق ڈاکٹر شومبس نے قرآن مجید پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی ایک علمی مجلس میں کہا تھا:

> ''بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن محمدؐ کی تصنیف ہے، یہ بہت بڑی غلطی ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کیا گیا ہے اس لیے کہ عہد ماضی کے واقعات کی مصدقہ اطلاع دینا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ناخواندہ کے بس سے باہر بات ہے، اس کلام کو سن کر عقل حیران ہو جاتی ہے، اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ تاریکیوں سے اجالوں کی جانب ہدایت کرتا ہے، آپ کو تعجب ہوگا کہ ایک یوروپی شخص اس حقیقت کا اعتراف کر رہا ہے تو سن لیجیے میں نے قرآن کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، میں نے اس میں بلند مضامین دیکھے، مجھے اس میں محکم نظم و ترتیب اور ایسی فصاحت و بلاغت نظر آئی جو میں نے کہیں اور (یعنی کسی اور کتاب میں) نہیں دیکھی، اس کا ایک جملہ کئی تصنیفات و تالیفات پر بھاری ہے اور بلاشبہ یہ عظیم معجزہ ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی جانب سے لے کر آئے ہیں۔'' (۳۰)

ماکس منی بھی ایک مستشرق ہے، اس نے بھی قرآن مجید کی اہمیت اور تمام شعبہ ہائے حیات میں اس کی ہدایت و رہنمائی کا اعتراف کھلے دل سے کیا ہے، وہ کہتا ہے:

> ''مسلمانوں کا تنہا رہنما قرآن ہے، قرآن محض دینی کتاب ہی نہیں ہے یہ ایک ایسا لٹریچر ہے جس میں سیاست و اجتماعیت کی ہی ہدایت نہیں ملتی بلکہ وہ تو انسانوں کے روزانہ معمولات کی جانب بھی ہدایت کرتا ہے، اگر اسلامی احکام کی وضاحت و تشریح قرآن میں موجود نہ ہو تو سنت میں موجود ہے اور قرآن و سنت میں نہ ہو تو حقوق اسلامی کے علم پر مشتمل اعلیٰ فقہ میں اس کی وضاحت موجود ہوگی

اوراسلام کی اس خصوصیت کا اعتراف تو اس کے دشمن بھی کرتے ہیں **الفضل ما شهدت به الاعداء۔**"(۳۱)

مختصر یہ کہ محمد طاہر بن عبدالقادر الکردی کاتب مصحف المکۃ المکرمۃ کی یہ تصنیف اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے، اس میں نہایت سلیقہ سے رسم مصحف عثمانی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے، بعض تحقیقات میں محاکمہ ومقارنہ کرکے تجزیہ کی خصوصیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، اس موضوع کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے، یہ وقت کی ضرورت بھی ہے اور کتاب الٰہی سے محبت کا تقاضہ بھی۔

حواشی

(۱) درج بالا معلومات مجلۃ البحوث والدراسات القرآنیہ عدد ۷ میں شائع ا۔د۔عبدالوہاب ابراہیم ابوسلمان کے مقالہ کی تلخیص ہے۔(۲) ایضاً۔(۳) تاریخ القرآن وغرائب رسمہ وحکمہ، ص ۸۔ (۴) ایضاً، ص ۶۔(۵) ایضاً، ص ۷۔(۶) ایضاً، ص ۸۔(۷) مصنف کے مطابق جرمنی کے شہر ہمبرگ میں ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۱ء کا سب سے پہلا مطبوعہ قرآن موجود ہے، اس کا ایک نسخہ دارالکتب العربیہ میں بھی ہے، ۱۴۳۱ء میں جرمنی میں قیام مطبع کے بعد ٹرکی میں سلطان احمد ثالث کے زمانہ میں مطبع قائم کیا گیا لیکن اس زمانہ میں قرآن کی طباعت احتراماً ممنوع تھی۔(۸) تاریخ القرآن، ص ۹۳-۹۴۔(۹) ایضاً، ص ۹۶۔(۱۰) ایضاً، ص ۹۷۔(۱۱) ایضاً، ص ۹۸۔(۱۲) ایضاً، ص ۱۰۰۔(۱۳) ایضاً، ص ۱۱۶۔(۱۴) ایضاً، ص ۱۰۳۔(۱۵) ایضاً، ص ۱۰۴۔(۱۶) ایضاً، ص ۱۰۵۔(۱۷) ایضاً۔(۱۸) ایضاً۔(۱۹) ایضاً، ص ۱۰۶۔(۲۰) ایضاً، ص ۱۱۲۔(۲۱) ایضاً، ص ۱۱۷۔(۲۲) ایضاً، ص ۱۱۸۔(۲۳) ایضاً۔(۲۴) ایضاً، ۱۲۲۔(۲۵) ایضاً، ص ۱۲۸-۱۳۱۔(۲۶) ایضاً، ص ۱۵۷۔(۲۷) ایضاً، ص ۱۶۷۔ (۲۸) ایضاً، ص ۱۶۷۔(۲۹) ایضاً۔(۳۰) ایضاً، ص ۱۹۔(۳۱) ایضاً۔

اخبار علمیہ

''نویں صدی عیسوی کا نسخۂ توریت''

اٹلی کی بلبونگا یونیورسٹی کی لائبریری میں توریت کا ایک قدیم نسخہ دریافت ہوا ہے، جس کے بارے میں ایک پروفیسر کا کہنا ہے کہ رول پر لپٹے غلط لیبل کی وجہ سے اب تک اس کی شناخت نہیں ہو پائی تھی، کاربن ڈیٹنگ کے ذریعہ جب اس کے عہد کی تفتیش کی گئی تو پتہ چلا کہ یہ 850 سال قبل کا لکھا ہوا ہے، عبرانی ماہرین کا بیان ہے کہ اب تک کے دستیاب توراتی نسخوں میں قدامت کے سبب یہ نسخہ گراں قدر اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں جس رسم الخط کا استعمال ہوا ہے وہ مشرقی بیبیلون کے روایتی طرز کتابت کی جانب نشاندہی کرتا ہے، اس کی کاربن ڈیٹنگ جانچ میں بہت سی ایسی چیزیں سامنے آئی ہیں جو اس کے بعد کے نسخوں میں نہیں ہیں۔

''منفرد طرز تعمیر کی حامل مسجد''

ملیشیا کے علاقہ پتراجیہ میں ''ٹنکو زین العابدین مسجد'' کی تعمیر کا آغاز اپریل ۲۰۰۴ء میں ہوا اور اس کی تکمیل ۲۰۰۹ء میں عمل میں آئی جس کا افتتاح سلطان زین العابدین نے کیا، اس کی تعمیر میں ۷۰ فیصد اسٹیل اور ۳۰ فیصد شیشے کا استعمال کی گئی ہے اور ایک اندازے کے مطابق ۶۰ ہزار ٹن سے زیادہ اسٹیل اس جدید آرکیٹکچر کی اعلیٰ ترین نمونہ والی مسجد میں استعمال کیا گیا ہے اس کو سیارہ نما روشنیوں سے سجایا گیا ہے، محراب کے اوپر کلمۂ توحید، اس کے اندر اسماء حسنیٰ، سورہ اسرا کی آیات ،اس کے دائیں جانب سورۂ بقرہ اور بائیں سورۂ ابراہیم مرقوم ہے، وضوخانہ بیضوی شکل میں ہے، صحن کشادہ ہے، AC نہ ہونے کے باوجود مسجد ٹھنڈی رہتی ہے۔

''کھانوں میں کیڑے مکوڑوں کا استعمال''

عالمی ادارہ خوراک سے وابستہ ماہرین کا کہنا ہے کہ کیڑے مکوڑوں میں پروٹین اور ایسے معدنی اجزا موجود ہوتے ہیں جو انسانی تغذیہ کے لیے اہم عنصر ہیں، مثلاً کیڑوں میں پروٹین کی

مقدار دوسرے استعمال کیے جانے والے جانوروں کے بالمقابل ۱۲ گنا زیادہ ہوتی ہے اور اس قسم کے کیڑے مکوڑوں میں ماحولیاتی آلودگی اوران سے خارج ہونے والی مضر گیسوں کے اخراج میں اضافہ بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا بھڑوں اور بھنوروں کی پرورش و پرداخت پر خصوصی توجہ دے کر غذائیت کی کمی کے شکار بچوں کو بھوک کے درد سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔ان میں خنزیروں کے بالمقابل امونیا گیس کا اخراج بہت معمولی ہوتا ہے جو فضاؤں کی آلودگی کا اہم سبب ہوتی ہے۔ دنیا کے بہت سے ممالک مثلاً افریقہ کے جنوبی ملکوں میں کیٹر پیلر نامی کیڑے انتہائی مہنگے اور پرتعیش کھانوں کی زینت بنائے جاتے ہیں۔

''آبشار شعلہ بار۔ایک معمہ''

العربیہ نیٹ کے مطابق نیویارک کے مغرب میں ''یارک رج'' کے ایک آبشار کے نیچے مقامی روایت کے مطابق صدیوں سے جلتا ہوا شعلہ زائرین کے لیے باعث کشش اور محققین کے لیے معمہ بنا ہوا ہے، پہلے کے تحقیقی نتائج میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ پانی کے نیچے موجود پتھروں سے گیسوں کا اخراج اس کا سبب ہے لیکن امریکہ کی انڈیانا یونیورسٹی سے وابستہ محققین نے اس سے اختلاف کیا ہے جس سے اس کے راز پر مزید پردے پڑ گئے ہیں اور انہوں نے پانی کے نیچے کسی بھی ایسی گیس کے وجود کی نفی کردی ہے جو اس شعلہ فشانی کا سبب بن سکے، انہوں نے اس کے تسلسل پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے آبشار کے نیچے متعدد گیسوں کے اجتماع کو اس کا اصل سبب قرار دیا ہے اور اس کے دیگر ارضی اسباب کی جانب بھی نشاندہی کی ہے۔

''ایس ایم ایس کے منفی اثرات پر تحقیق''

امریکی محققین کے ایک نئے تحقیقی جائزہ میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ نوخیز اور کچی عمر کے نوجوانوں میں ایس ایم ایس کے استعمال کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے، اس سے ایک طرف تو ان کے نطق اور قرأت کی صلاحیتوں پر منفی اثر پڑ رہا ہے اور دوسری طرف پیغامات میں حروف کی جگہ مختصر اور غلط لفظوں کو صحیح سمجھنے کے عوامی میلان میں بھی مسلسل اضافہ ہورہا ہے، اس

کے علاوہ You کی جگہ u اور are کی جگہ r یا for کی جگہ عدد 4 کا استعمال زبان و بیان کے نحوی قواعد وضوابط کی پابندی کو بھی ذہن سے محو کر رہا ہے، لہٰذا اس جدید ٹیکنیکل سہولت کے مضر اثرات سے تحفظ پر غور کرنے کی ضرورت بڑھ گئی ہے، یہ تحقیق طریق الاخبار قاہرہ ۲۷/ اگست ۱۲ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔

''دوران امتحان پانی کا استعمال''

لندن کی مشرقی یونیورسٹی سے وابستہ گریس باوسن نے یونیورسٹی سطح کے ۴۴۷ طلبہ کی تین الگ الگ ٹولیاں بنا کر اس بات کی تحقیق کی کہ پانی یا اس قسم کے دوسرے مشروبات دوران امتحان استعمال کرنے اور نہ کرنے والے طلباء کے درمیان باہم نتائج کے لحاظ سے فرق واقع ہوتا ہے یا نہیں۔ حاصل شدہ معلومات کے مطابق جن طلبہ نے امتحان کے دوران پانی وغیرہ کا استعمال کیا تھا، ان کے نمبرات ان سے بہتر تھے جنھوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ محققین نے یہ بھی لکھا ہے کہ پانی قوت فہم وحافظہ کو تر وتازہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اس نفسیاتی تکلیف یا دباؤ کے ازالہ کا سبب بھی بنتا ہے، جو امتحان کے وقت طلبہ خاص طور پر محسوس کرتے ہیں۔

''گیلئیم''

گیلئیم ایک پگھلنے والی دھات ہے، اس کا سیالی نقطہ 76.29 سینٹی گریڈ اور 57.85 فارن ہیٹ ہے، اس کی خاص بات یہ ہے کہ ہاتھ کی گرمی سے بھی یہ دھات مائع کی طرح پگھلنے لگتی ہے اور دوسری دھاتوں مثلاً المونیم میں سرایت بھی کرتی جاتی ہے۔ اس کی دریافت ۱۸۷۱ء میں Dimitri Mendeleev نے کی تھی، لیکن اس غیر معمولی عنصر کی خصوصیات کو فرانسیسی کیمیاداں Paul Fmile Lecoqie de Boisbaudrain نے ۱۸۷۵ء میں تجربہ کے ذریعہ منکشف کیا۔

ک، ص اصلاحی

آثار علمیہ و تاریخیہ

خطوط ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ
بنام پروفیسر سعید الظفر چغتائی
(۲)

۶۔۱۲

4, Rue de Tournon
Paris VI 75
۱۹؍جمادی الآخرہ ۱۳۸۸ھ

مہربان بندہ زادمجدکم۔ سلام مسنون۔ مزاج گرامی؟

کچھ عرصہ قبل عنایت نامہ ملا تھا۔اور کل شام ''بال جبریل'' بھی پہنچی۔ممنون بھی ہوں اور تکلیف دہی پر شرمندہ بھی۔اب انشاءاللہ آج ہی سے مقابلے کا کام شروع کرتا ہوں،اگر چہ نہ یہ میرا فن ہے اور نہ اس کی توقع ہے کہ کوئی اصلاح طلب چیز پا سکوں۔بہرحال اپنا فریضہ انجام دینے میں کوتاہی نہ کروں گا۔لیکن لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا

توقع ہے کہ آپ کا علمی کام کامیابی سے جاری ہوگا☆

۶۔۱۳

4,r. Tournon,
75-Paris VI

۲۱؍شعبان ۱۳۸۸ھ (پوسٹ کارڈ)

محترمی زادمجدکم۔سلام مسنون۔خدا کرے آپ خیریت سے ہوں آپ کا پاریس میں

☆ بال جبریل کے ہمارے ترجمے پر یونسکو کے ماہر کے طور پر نگاہ ڈال رہے ہیں۔اپنی بے پناہ مصروفیتوں پر ترجیح دے کر میرا ہی کام کر رہے ہیں اور مجھی سے معذرت کر رہے ہیں ع گنہ بندہ کردہ است واو شرمسار

انتظار رہا۔

مہینے بھر سے زائد ہوا کہ مادموازیل بوساک کو میں نے رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے ترجمہ وغیرہ بھیجا تھا۔خلاف عادت اس نے رسید تک نہیں بھیجی۔خدا کرے وہ بیمار نہ ہوگئی ہو۔

رمضان آرہا ہے۔اس کے برکات کی آپ سب کے لیے دعا ہے۔بال جبریل کا آپ کا نسخہ کیا واپس کردوں؟

مخلص محمد حمید اللہ

Iveg-14, Lund ض Fysiska Inst.,S

۱۴-۶

4 r.Tournon

Paris VI

شنبہ،۳۰؍شوال ۱۳۸۸ھ (پوسٹ کارڈ)

محترمی۔سلام مسنون ورحمۃ اللہ

گزشتہ دو تین ہفتے بڑی مصروفیت اور بے چینی میں گزرے اور یاد نہیں کہ میں نے آپ کو خط لکھا یا نہیں۔اگر نہیں تو قصور معاف فرمادیں۔

آپ کا مرسلہ منی آرڈر پہنچا☆۔اس کی کوئی جلدی نہ تھی۔خدا کرے آپ خیروعافیت سے ہوں۔اگر کسی کار لائقہ سے یاد فرمائیں تو باعث مسرت ہو۔مادموازیل بوساک نے تا حال کوئی خط نہیں لکھا ہے،غالباً مصروف ہوگی۔

مجھے ترکی سے دعوت آئی ہے۔خدا نے چاہا تو مارچ کے آغاز پر تین ماہ کے لیے وہاں جاؤں گا۔میرا وہاں کا پتہ Faculty of Letters, Istambol (ادبیات فاکلتے استانبول) کافی ہے،احتیاطاً لکھتا ہوں۔

مخلص:محمد حمید اللہ

کیا میں ایک نئی تکلیف دے سکتا ہوں؟لُونڈ یونیورسٹی لائبریری میں اُلخمیاء دو قلمی کتابیں

☆ سوئیڈن جاتے وقت میں نے ان سے قرض لیا تھا،وہی واپس کیا۔

ہیں۔یعنی اسپینی زبان میں جو عربی خط میں لکھی جاتی تھی۔کبھی فرصت ہو تو پتہ چلائیے کہ آیا ان میں کوئی ترجمہ قرآن مجید بھی ہے یا نہیں۔باعث ممنونیت ہوگا۔(مگر اس میں کوئی جلدی نہیں)

مخلص: حمیداللہ

Fysiska'n. Lund, Sweden

۶۔۱۵

4, Rue de Tournon

Paris VI 75

۱۴/جمادی الآخر ۱۳۸۹ھ

مکرمی دام لطفکم۔سلام مسنون۔خدا کرے آپ خیر و عافیت سے ہوں۔

سوزان بوساک تعطیلوں میں یہاں آئی ہوئی ہیں۔گوڈری کا لال ہے۔بال جبریل کی نظر ثانی الحمدللہ مکمل ہوگئی۔اس بے چاری پر اب اس کے بار سوم ٹائپ کرانے کا بار ہے۔میں نے کہا کہ آدھی کتاب میں خود ٹائپ کر دیتا ہوں مگر نہ مانا۔

اسی سے معلوم ہوا کہ آپ اکتوبر میں پاریس تشریف لا رہے ہیں۔انشاءاللہ ملاقات کی مسرت حاصل ہوگی۔اگر اس اثناء میں کسی دن فرصت ملے تو توقع ہے کہ لونڈ لائبریری میں الخمیاء (یعنی عربی خط والی ہسپانوی) زبان کے مخطوطات کا پتہ چلانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ آیا ان میں کوئی تراجم قران بھی ہیں یا نہیں۔

یہاں موسم گرما یعنی اگست میں آتش دان جلانے کی ضرورت پیدا ہوگئی ہے۔

دیگر احوال الحمدللہ گزر رہے ہیں۔ مخلص محمد حمیداللہ

Ivegatan ض Physics Institute, 14S

۶۔۱۶

4, Rue de Tournon

Paris VI 75

۲۷/رجب ۱۳۸۹ھ شب معراج

مکرمی دام لطفکم۔سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

عنایت نامہ ملا۔خدا آپ کو حسنات دارین عطا فرمائے۔مادموازیل بوساک کی روانہ

کردہ ترجمے کی کاپیاں آگئی ہیں۔ آپ کے لیے چشم براہ ہوں۔ ایک چھوٹی سی عرض ہے۔ اگر آپ اپنی آمد پر اپنی قیام گاہ کی پہلے سے بھی اطلاع دے دیں تو مناسب ہوگا۔ بعض وقت آپ میرے ہاں زحمت فرماتے ہیں اور اتفاق سے میں موجود نہیں ہوتا ہوں تو پھر آپ سے تماس پیدا کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔

براہ کرم اپنے Soutenace☆ سے بھی اطلاع دیجیے۔ اگر جامعہ کی اجازت ہو تو میں بھی اس دن تماش بینوں میں شامل ہوسکوں گا۔ خادم: محمد حمید اللہ

۶۔۱۷

4, Rue de Tournon
Paris VI 75
۱۴/ذی قعدہ ۱۳۸۹ھ

محترمی دام لطفکم

سلام مسنون۔ عنایت نامہ ملا۔ ممنون ہوا۔ خدا آپ کو جلد صحت کامل عطا فرمائے۔

بال جبریل کے متعلق کسی موسیو D'Olsson نے مجھے خط لکھا تھا۔ دفتری کارروائی جاری ہے۔ نجی اطلاع تو یہ ہے کہ الحمدللہ کتاب منظور ہوگئی ہے۔ تکمیل ضابطہ باقی ہے۔ مبارک ہو!

دیگر حالات گذر رہے ہیں۔ ممکن ہے آپ جلد ڈاکٹریٹ کے لیے تشریف لائیں اور زندگی میں مکرر شرف و نیاز حاصل ہوجائے۔ ورنہ اس بوڑھے کی دعا لیجیے اور خدمت دین کیے جائیے۔

مخلص محمد حمید اللہ

۶۔۱۸

Madame Sfier
4, Rue de Tournon
Paris VI 75
۲/رجب ۱۳۹۰ھ

عزیز محترم۔ سلام مسنون

☆ ڈاکٹریٹ کا یہ میراز بانی اور آخری امتحان پیرس میں کبھی نہ ہوا۔ حاسد کی نذر ہوگیا۔ ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۲ء میں نئی تھسس لکھ کر مجھے لندن اور علی گڑھ سے اسناد ملیں۔

تین ہفتے کے سفر کے بعد واپس آیا تو عنایت نامہ ملا۔ جواب فوراً دے رہا ہوں۔

مس سوزان بوساک ابھی فرانس ہی میں ہیں۔ اگست کے شروع میں ایک ہفتہ بھر اقبال کے لیے مکرر وقف کیا۔ اصل میں بال جبریل کی دو اردو شرحیں چھپی تھیں۔ پاکستان میں۔ انہیں منگایا اور ہر ہر بیت کے ترجمے کا ان دونوں سے مقابلہ کیا۔ خاص کر جہاں مطلب ہمیں سمجھ میں نہ آیا تھا۔ بعض نجی خط بھی لکھے ماہر القادری وغیرہ کو کہ فلاں بیت کا مطلب وہ کیا سمجھتے ہیں۔

یونیسکو والے محمد طفیل صاحب سے معلوم ہوا کہ ترجمے کی طباعت اصولاً منظور ہو چکی ہے۔ آج کل وہ ایک فرانسیسی (۱) کو دیا گیا ہے کہ فرانسیسی زبان کے نقطہ نظر سے جانچے۔ یہ صاحب عجلت پسند نہیں ہیں۔ بہرحال ۱۹۷۱ء کے موازنے (بجٹ) میں اس کے لیے رقم مل سکتی ہے، اس سے پہلے نہیں۔

فلاں (۲) صاحب سے میری ناچیز رائے ادب کے ساتھ فرمائیے کہ آدمی اپنی ذاتی رقم سے علمی سفر کرے تو وقت کی قدر بھی ہوتی ہے اور عزت نفس بھی ملحوظ رہتی ہے۔ جو لوگ بھیک پر پڑھتے ہیں (اسکالرشپ کو میں بھیک ہی سمجھتا ہوں) وہ اس بھیک دینے والے کے اخلاقاً تابع ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز حریت نفس کا خون کرتی ہے۔ ویسے اسکالرشپ دلانا میرے بس کی چیز نہیں۔ یہ کام دہلی میں مقیم سفیر انجام دیتے ہیں، ترک ہوں یا فرانسیسی۔

احسان الحق صاحب (۳) کا خط نہیں آیا۔ ان سے بھی اور آپ سے بھی مکرر عرض ہے کہ میرے نام کے خط مذکورہ بالا نام پر بھیجے جائیں۔ میری لینڈ لیڈی وہ اپنے نام پر ہونے کے باوجود مجھے دے دے گی۔ میرا نام لفافے پر نہ لکھیں۔

---

(۱) یہ مشہور عالم ماہر سماجیات پروفیسر میکسم رُدیں سوں نکلے۔ ان کی تفصیلی سفارشات ترجمہ میں از سرنو داخل کرنے کی فرصت مادام بیوسک نہ نکال سکیں۔ کتاب چھپی تو موصوف نے Le Monde میں اس کے خلاف سخت تبصرہ لکھا۔ (۲) فلاں ان دنوں علی گڑھ کی کلیات دینیات میں محقق تھے۔ ان کے بارے میں میں نے ہی لکھا تھا۔ ان غریب کا کوئی قصور نہ تھا۔ (۳) حاجی احسان الحق ہمارے شعبہ طبیعیات (مسلم یونیورسٹی) کے برسوں پہلے رٹائرڈ ہونے والے لکچرر تھے۔ علم ہیئت سے دلچسپی رکھتے تھے۔ میرے مضمون ''ہفتہ کیسے بنا'' میں یہ گتھی انہیں نے سلجھائی تھی کہ ہفتہ کے ناموں کی یہ ترتیب کیسے قائم ہوئی۔

سرسید کی طرف ایک تفسیر بائبل منسوب (۱) ہے۔ کیا اس کا کوئی نسخہ مل سکتا ہے؟ فوٹو لیں تو کتنے مصارف ہوں گے؟ کبھی فرصت میں عجلت کے بغیر اس کا پتہ چلائیں تو ممنون ہوگا۔

خدا کرے آپ خیر و عافیت سے ہوں۔ نیازمند

م ح ا

Physics Dept, Muslim Univ, Aligarh, UP, INDE

۱۹۔۶

پاریس

۲۴ رجب ۱۳۹۰ھ (۳ ستمبر ۷۰ء)

محترمی

سلام مسنون۔ عنایت نامے کا شکریہ اور بتائی ہوئی تجویز بھی اچھی ہے۔ اولین فرصت میں عمل کروں گا۔ آج کل میری لینڈ لیڈی، جن سے آپ واقف ہیں، بہت سخت علیل ہیں اور شفاخانہ میں ہیں۔ ڈاکٹر زیادہ امید نہیں دلاتے۔ ہر چیز خدا کے ہاتھ ہے۔

بال جبریل کی فہرست مترجمین میں تو کیا رہا، میں نے مادموازیل بوساک سے کہہ رکھا ہے مقدمے میں بھی میرا نام نہ لکھیں۔

مقدمے کے اردو ترجمے میں کوئی حرج نہیں۔ انتظار کی ضرورت نہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے تازہ کُرّاسے (Fascicule) میں شِمل نے اقبال پر ایک اچھا مضمون لکھا ہے۔ اگر اس کی روشنی میں آپ مقدمہ بدلنا چاہیں تو ابھی وقت ہے۔ آپ مقدمے میں یہ نہ لکھیں کہ آپ کا فرانسیسی ترجمہ یونیسکو میں چھپ رہا ہے کہ یہ ابھی قبل از وقت ہے☆۔

نیازمند

ح

Physics Dept, Muslim Univ, Aligarh, UP, INDE

(۱) **تبیین الکلام علی تفسیر التوراة والانجیل علی اهل الاسلام**، اس وقت ''سرسید کی محفوظ الماری میں بند تھی''۔ اب سرسید اکادمی نے دو جلدوں میں چھاپ دی ہے۔ ☆میں نے ایسا کچھ بھی نہ کیا۔

۶۔۲۰

Centre Cultural Islamic

4, Rue de Tournon,75,Paris VI

۱۲/شوال ۱۳۹۰ھ پنجشنبہ

محترمی زادمجدکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ ملا۔ مادام صفیر کا یکم اکتوبر کوئی ماہ کی علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ پھر خدا کو حساب دینا ہے۔ مادموازیل بوساک کا تبادلہ ہوگیا ہے اور نیا پتہ اب یہ ہے:

te d'Ivoireش B.P.No.20661, Abidjan,C

حال ہی میں وہ سخت علیل رہیں۔ بال جبریل کی ایک تیسری شرح بھی شائع ہوئی ہے۔ تعریف سنی ہے، منگائی ہے۔ شاید آپ کے ترجمے کی کوئی مزید اصلاح ہوسکے۔

ایک جامعہ پاریس اب ۱۳ جامعات میں بٹ گئی ہے۔ اس سال نفاذ ہوا ہے۔ اس لیے فی الحال تو بحران ہی ہے۔

کیا رامپور میں کوئی آپ کے دوست ہیں یا آپ وہاں جاسکتے ہیں۔ وہاں کتب خانے میں **اصول الفقه لابی الحسن الکرخی** ہوتی بیان کی جاتی ہے (حوالہ؟) میکروفلم مل سکتا ہے تو کیا کہنا۔ کم ازکم کوئی صاحب علم ورق گردانی کرکے وہ باب دیکھیں جو **شرائع من قبلنا** (سابقہ انبیاء کی شریعت یا کتب منزلہ کا حکم) ہے۔ اس مختصر باب کو ہاتھ سے نقل کرسکیں تو جو مصارف ہوں وہ بھی گزران سکتا ہوں☆

خدا کرے آپ خیروعافیت سے ہوں۔ اور آپ کے محترم والدین بھی۔

☆ سردار مرزا صاحب کو لکھا ۱۵/دسمبر ۷۰۔ جواب ملتے ہی مخدومی پروفیسر کو مطلع کیا۔ ۳۱/دسمبر ۷۰ء۔

۶۔۲۱

Centre Cultural Islamic
4,Tournon,75,Paris VI
۶/ ذی قعدہ ۱۳۹۰ھ

محترمی زادمجدکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جزاکم اللہ احسن الجزاء ۔

بزدوی کی اصول فقہ چھپ گئی ہے اور میں اس سے واقف ہوں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ کرخی کا رسالۂ اصول فقہ جو آپ کے مطابق نو دس صفحوں میں ہے، ہاتھ سے نقل ہو جائے؟ کسی مقامی کاتب سے کام لیں اور اجر مع مصارف ارسال سے ازراہ نوازش آگاہ کریں تو فوراً رقم بھیج دوں۔☆

میں انشاءاللہ فروری کے آخر میں ترکی چلا جاؤں گا۔ تین ماہ رہنا ہے۔ خدا کرے آپ سے جولائی میں ملاقات ہو سکے۔ اس زمانے میں ہفتہ عشرے کے لیے الجزائر جانا ہے۔

واللّٰہ المستعان ۔ نیازمند

ح

Physics Dept, Muslim Univ, Aligarh, UP, INDE

۶۔۲۲

Centre Cultural Islamique
4, Rue de Tournon,
Paris VI 75
۲/ جمادی الاول ۱۳۹۱ھ

محترمی۔ سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کچھ عرصہ قبل ایک عریضہ گزرا تھا۔ خدا کرے مل گیا ہو۔ ترکی سے واپسی کے بعد ایک نئی

☆ رام پور لکھا، ۱۱/ جنوری ۷۱ء۔

شرح بال جبریل از عبدالرشید فاضل سے استفادے میں مشغول ہوں۔انہوں نے الفاظ کی شرح کم ہی کی ہے۔بہر حال اس پر بھی نظر پاشی ضروری ہے۔

اس اثناء میں مس بوساک کے ایک نوٹ کی بناء پر آپ سے استدعا ہے کہ ذیل کی غزلوں کی بحر سے مطلع فرمائیں۔ میں اس فن میں کورا ہوں۔عربی بحریں تو ریاضی کی مدد سے نکال لیتا ہوں بشرطیکہ زحاف وغیرہ زیادہ نہ ہوں۔مگر اردو کی تقطیع میرے لیے ناممکن ہے۔مس بوساک نے فرنگی اشارے لا۔لا۔لا وغیرہ برتتے ہیں۔اگر آپ یہ کر سکتے ہیں تو فبہا۔ورنہ پھر یہ کیجیے کہ جس نظم کی بحر درکار ہے اگر وہ بال جبریل کی کسی اور نظم میں بھی استعمال ہوئی تو اس کا ذکر فرما دیجیے تا کہ میں حسبہٖ تلاش کرلوں۔ذیل کی نظموں کی بحر درکار ہے۔

صفحہ۲۷ (وہی میری کم نصیبی) صفحہ۴۲ (یہ کون غزل خواں)

صفحہ۸۵ (نہ ہو طغیانی) صفحہ۱۱۲ (شعور و ہوش)

صفحہ۱۶۱ (الارض للہ) صفحہ۱۶۲ (ایک نوجوان کے نام)

صفحہ۲۰۱ (نپولین کے مزار پر) صفحہ۲۰۹ (ابوالعلامعری)

صفحہ۲۱۵ تا آخر کتاب (ابلیس کی عرضداشت وغیرہ ساری نظموں کی بحریں)

زحمت دے رہا ہوں۔معاف فرمائیں۔مس بوساک کا انتظار ہے۔معلوم نہیں کب آنے والی ہیں۔طباعت کا مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا۔معلوم ہوا ہے کہ آیندہ اکتوبر کی مجلس میں قطعی قرار داد عمل میں آئے گی۔امید تو کم ہی ہے کیونکہ دفتر کو اعتراض ہے کہ اقبال کی متعدد کتابیں (فارسی) کی چھپ چکی ہیں۔ہمارا جواب ہے کہ اردو زبان کی کوئی نہ چھپی۔جو خدا کو منظور ہوگا وہی بہتر ہوگا۔

کیا آپ کے لیے ممکن ہے کہ آپ کے ہاں شعبہ اردو کی ڈاکٹر ثریا سلطانہ حسین کا موجودہ پتہ (ایران میں) معلوم کرسکیں؟ اس نے مجھے استامبول خط لکھا مگر اپنا پتہ نہ دیا۔سہواً

خدا کرے آپ خیر و عافیت سے ہوں۔ مخلص

م۔ح۔ا

۶۔۲۳

4,r Tournon,
75,Paris VI
۲۲؍ج۹۱ء

مکرمی سلام مسنون۔

دو دن ہوئے آپ کے عنایت نامے کا جواب دے چکا ہوں۔ڈاک کے نرخ میں بلا اطلاع تبدیلی ہوجانی معلوم ہوئی۔ممکن ہے وہ خط کم ٹکٹ پر تلف کردیا گیا ہو۔

اس میں لکھا تھا کہ چند نظموں پر وزن کے تیر کمان۔ل۔ل مفقود ہیں۔فعولن مفاعیلن کی ضرورت نہیں اور میں اس قابل نہیں کہ ان فعولن مفاعیلن کو خود ہی تیر کمانوں میں منتقل کرسکوں۔ براہ کرم مکرر زحمت فرمایئے۔

تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل سے Le Temps نکل رہا تھا۔دوران جنگ میں جرمنوں نے اسے بند کردیا تو خود Le Monde نکلنے لگا جس کا اب اٹھائیسواں سال ہے۔اس کے لیے سرکاری امداد کا مجھے علم نہیں۔

ہیومانٹئی اور کانار کے پرچے کیا ہوائی ڈاک سے بھیجوا تا یا سمندری ڈاک سے؟ آخر الذکر کو تقریباً دو مہینے پہنچنے کو لگیں گے۔سر سید کی شرح بائبل اگر مستعار بھی ملے تو ہفتے عشرے میں واپس کردوں۔اب تک وہ مل نہ سکی۔

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔ مخلص

محمد حمید اللہ

دارالمصنّفین کا سلسلۂ مکاتیب

۱-مکاتیب شبلی حصہ اول	مرتبہ:سید سلیمان ندویؒ	قیمت=/150
۲-مکاتیب شبلی حصہ دوم	// // //	قیمت=/180
۳-برید فرنگ	// // //	قیمت=/35
۴-مشاہیر کے خطوط بہ نام سید سلیمان ندویؒ		قیمت=/45

معارف کی ڈاک

''جدید عربی ادب اور ادبی تحریکات''

۶۲۵/این ۱۳،
سیلنگ کلب روڈ، بٹلہ ہاؤس،
جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔
۲۰۱۳/۳/۱۸ء

برادم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی!

معارف فروری ۲۰۱۳ء کے شمارہ میں خاکسار کے شاگرد عزیزی ڈاکٹر ابوعبید کی کتاب ''جدید عربی ادب اور ادبی تحریکات'' پر ایک گراں قدر تبصرہ نظر سے گزرا، خوشی ہوئی مگر اس میں آپ نے خاکسار کے تذکرہ کی دو سطروں میں جس تجاہل عارفانہ اور تساہل عاقلانہ سے کام لیا ہے وہ ماشاءاللہ آپ کی قلمی چابک دستی کی زندہ مثال ہے۔

اس میں ایک طرف تو آپ نے نام سے پہلے مولوی یا پرفیسر لگانے سے گریز کیا ہے تاکہ ابہام رہے اور اہل مدارس پوری طرح میری شناخت سے ناآشنا رہتے ہوئے مدارس کے بارے میں میری تلخ رائے زنی پر دل کی بھڑاس نکال لیں یا کلمات طیبات سے نوازدیں۔

دوسری طرف آپ نے میری رائے ظاہر کرنے کے بعد تحریر فرمایا کہ ''یہ خیال کسی حد تک درست ہے اس سے قطع نظر'' کہہ کر پوری طرح اپنا پلّہ جھاڑ لیا یا کنارہ کشی اختیار کرلی، یہ آپ کی کمال دانشوری کی دلیل ہے، اللہ کرے زورقلم اور زیادہ۔

میرے نام معارف شاید دو ماہ سے نہیں آرہا ہے، یا تو چندہ نے دم توڑ دیا ہے یا نظر التفات کو نظر لگ گئی ہے۔ کوئی حرج نہیں جب میری عمر بھر کی چہیتی نگاہ نے ہی مجھ سے بے وفائی شروع کردی تو اور کسی کا کیا شکوہ۔

فقط والسلام

آپ کا ضعف رسیدہ

پروفیسر بدرالدین الحافظ

ادبیات

غزل

جناب شوقؔ مانوی

ایسی راہیں جن میں تو اب تک بھی گھبرایا پھرے
برسوں تیرے ساتھ ان میں صورت سایہ پھرے

تیرے ملنے کا کوئی امکاں نہ کچھ قدر خلوص
دل وہ دیوانہ ترے کوچہ میں ٹکرایا پھرے

دل کو ہے یہ انس تجھ سے فاصلوں کے بعد بھی
تیرے آنے کی خبر سن لے ، تو اترایا پھرے

تھک کے بیٹھا ہوں یہاں بھی ،کیسی جائے عافیت
اجنبی وادی میں کب تک کوئی گھبرایا پھرے

کام بگڑے تو بشر تقدیر کو الزام دے
بات بن جائے تو دانائی پہ اترایا پھرے

ظلمتیں رد کر نہیں سکتیں اندھیروں کو کبھی
روشنی کا رخ اگر بدلے ، تو پھر سایہ پھرے

دیجیے اب زندگی کو برگ و ساز زندگی
زندگی ایسی بھی کیا ، جینے سے اکتایا پھرے

کچھ بتا اے شوقؔ ایسا کیوں ہے اور وہ کون ہے
آنکھ سے اوجھل اگر ہو ذہن پر چھایا پھرے

سہارن پور۔

مطبوعات جدیدہ

محفل قرآن : از مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۶۴۴، قیمت: ۳۰۰ روپے، پتہ: الفرقان بک ڈپو، ۱۱۴/۳۱ نظیر آباد، لکھنؤ۔

آل عمران، النساء اور المائدہ ان تین بڑی سورتوں کے ترجمہ، تفسیر اور تشریح پر مشتمل یہ کتاب دراصل فاضل مفسر کے ان قرآنی مضامین کا مجموعہ ہے جو موقر رسالہ الفرقان میں شائع ہوتے رہے، اس سے پہلے سورہ الفاتحہ والبقرہ کے مضامین 'قرآن کے دو باب' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے اور معارف میں اس کا تذکرہ بھی آچکا ہے، زیرنظر کتاب گویا اسی سلسلے کی دوسری جلد ہے، فاضل مصنف مطالعہ، تدبر، تفکر، عصری تقاضوں سے باخبری اور اپنے سلجھے اسلوب کے لیے معروف ہیں، خصوصاً قرآن مجید سے ان کا تعلق جو لکھنؤ کی مسجدوں سے شروع ہوا، اس کی تبلیغ، تدریس اور تفہیم کا سلسلہ اب لندن کی فضاؤں میں بھی جاری ہے، زمان ومکان کے تغیرات کا ایک عطیہ، تقلید وجمود کے بے سود ہونے کا احساس بھی ہے، مولانا موصوف کی تحریر اور فکر میں تحقیقی اور منطقی اور غیر جذباتی عناصر کی موجودگی، اسی احساس کا ثمرہ نظر آتی ہے، جس کی تائید اس محفل قرآن سے بھی ہوتی ہے، انداز یہ ہے کہ آیات ہیں ترجمہ ہے اور پھر سورہ کا مختصر تعارف ہے اور پھر ذیلی سرخیوں کے تحت ایک ہی مضمون پر مشتمل کئی آیات کی تشریح ہے جو الگ الگ محفلوں کو نہایت مفید، دلنشین اور موثر بیانوں سے آباد کرتی جاتی ہے، قریب ستر محفلیں ہیں اور ہر محفل کا ایک جامع عنوان بھی ہے جیسے یہ کہ "یہ متاع دنیا کی محبت ہے جو لوگوں کو حق سے روکتی ہے، بہانے اگرچہ لوگ کچھ اور بنالیا کرتے ہیں"، عام تفسیروں سے جدا ہوتے ہوئے بھی علم تفسیر کے معیار اور اقدار کی پاسداری میں کمی نہیں، صرفی، نحوی، فقہی مقامات سے صرف نظر نہیں کیا گیا لیکن اصل مقصد انسان اور مسلمان کے تعلق سے بیان قرآن کا ادائے فریضہ ہے، سورہ النساء میں او ما ملکت ایمانکم کے سلسلے میں کہا گیا کہ "یہ اس وقت کے عالمی ماحول میں جب کہ یہ آیتیں نازل ہورہی تھیں، جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے مسئلے کا ایک حل تھا آج وہ ماحول نہیں تو ان الفاظ میں نظر آنے والی اجازت کا تعلق بھی ہم سے نہیں ......، یہ ہمارے زمانہ کا مسئلہ نہیں"،

مولانا سنبھلی نے ان روشن خیال مسلمانوں کی جانب اشارہ کیا جو اسلام کے قانون میں باندیوں سے تمتع بغیر نکاح کے معاملہ میں عام روش سے مطمئن نہیں، جیسے مفسر قرآن محمد اسد جن کی تفسیر یا تشریح سے مولانا موصوف متفق نہیں لیکن یہ وہ مقام ہے جہاں خود مولانا کی سرسری دلیل سے اطمینان نہیں ہوتا، صرف یہ کہہ دینا کسی قرآنی بیان کے لیے کافی نہیں کہ ''یہ ہمارے زمانہ کا مسئلہ نہیں''، غالباً اس مسئلہ کی طوالت کے پیش نظر اختصار سے کام لیا گیا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ''قرآنی مضامین کو مرتب اور مربوط انداز سے سمجھنے میں'' یہ کتاب بہت مفید ہے، مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی کے تعارفی کلمات، صاحب کتاب کی مرتبہ شناسی کے لیے صحیح معنوں میں کلمات معرفت ہیں کہ ''قرآن کی نسبت سے علم و تدبر کا کارواں، اس دور انحطاط میں بھی رواں دواں ہے، قرآن کے عجائبات، الفاظ و معانی اور نئے نئے اشارات و اسرار سامنے آتے جاتے ہیں''۔

آخری سورتوں کے درس: از جناب خرم مراد مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت مناسب، جلد اول ۳۰۴، دوم ۳۱۶، قیمت: مفت برائے تقسیم، پتہ: مولانا صدرالدین اصلاحی اکیڈمی (دارالقرآن)، سرائے میر، اعظم گڑھ۔

سورۃ الشّمس سے سورۃ الناس تک قرآن مجید کی آخری سورتوں کی تفسیر اور ترجمانی کی یہ کوشش اس مقصد سے ہے کہ گو یہ سورتیں مختصر ہیں لیکن ان کے مضمون بڑے جامع ہیں، نمازوں میں عام طور سے یہ چھوٹی چھوٹی سورتیں زبان پر آتی ہیں، اگر ان کا مفہوم و مطلب بھی ذہن میں رہے تو ظاہر ہے، تلاوت کی لذت میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ جناب خرم مراد مرحوم بھی ان شخصیتوں میں ہیں جنہوں نے قرآن کے پیغام کو عام کرنا اپنا فرض اولین سمجھا، ان کا یہ ایک جملہ ہی ان کے قرآن مجید سے تعلق کا خوبصورت غماز ہے کہ ''دل کی زندگی ہو یا امت کی زندگی، قرآن مجید سے وابستہ ہے''، وہ آج کل کی زبان میں تحریکی انسان تھے، لیکن دیکھا جائے تو قرآن مجید سے تعلق نے ان کے قلب و ذہن کا جس طرح تزکیہ کیا اس کا نور ان کی ہر تحریر و تقریر سے ہمیشہ جھلکتا رہا، ان سورتوں کی تفسیر میں بھی یہی روح موجود ہے اور اس وضاحت کے ساتھ ہے کہ ''مقصد صرف ابلاغ عام اور تذکیر ہے، دلوں کی زندگی کا سامان اور دعوت عمل ہے''، جناب خرم مراد مرحوم کی مراد ان کتابوں سے پوری ہوتی نظر بھی آتی ہے۔ خوب ہوا کہ مولانا سکندر علی اصلاحی نے قرآن مجید

کے پیغام کو عام کرنے کے مقصد سے ان دونوں کتابوں کی اشاعت کا اور عام فائدے کے لیے ان کو مفت تقسیم کرنے کا اہتمام کیا، خدا کرے ان کے پیش نظر ہندی اور انگریزی میں اس کے ترجمہ کی ضرورت بھی پوری ہو۔

شاہجہاں پور، تاریخ عمومی اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء: مرتب و مدون ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۶۲۴، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ رشیدیہ بالمقابل مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی، پاکستان۔

کتاب کا نام اور بھی دراز ہے یعنی 'روہیل کھنڈ اور آزادی بہ شمول محمدی میں قومی حکومت کا قیام اور تذکار مجاہدین آزادی اور سرفروشان وطن' صاف ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی تحریک آزادی میں یوپی کے روہیل کھنڈ علاقہ نے جس غیر معمولی اور امتیازی شجاعت، غیرت اور حمیت کا مظاہرہ کیا، اس کا ذکر عام طور سے اور شاہجہاں پور کی سرفروشی اور اس کے فرزندوں کے ذریعہ لہو سے لکھی گئی داستان کو خاص طور سے اس کتاب کا موضوع بنایا گیا ہے، قصبہ محمدی اگرچہ روہیل کھنڈ میں نہیں آتا لیکن روہیل کھنڈ سے قربت اور غیور افغان کی بہادری کے کچھ سلسلے وابستہ ہونے سے اس کے لیے وجہ جواز کی ضرورت پوری ہوگئی۔ کتاب نے کتنی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اس کا احساس تو مطالعہ ہی سے ممکن ہے۔ ڈاکٹر شاہجہاں پوری نے ترتیب و تدوین کی دنیا میں جس طرح اپنا منفرد مقام بنایا ہے، اس کے لیے بھی ایک حکایت لذیذ تر کی ضرورت ہے، مولانا آزاد، مولانا مدنی، بزرگان دیوبند، تحریک آزادی، تقسیم ہند خدا جانے ایسے کتنے موضوعات ہیں جن کے متعلق نہایت مستند اور بیش قیمت معلومات، زمانہ کی گردش یا اہل زمانہ کی ناقدری کے باعث مستور ہی نہیں معدوم سی ہو چکی تھیں، ڈاکٹر صاحب کی بے مثال محنت واقعی نہایت قدر کے لائق ہے کہ انہوں نے ان کو محفوظ ہی نہیں کیا، ان کے ذریعہ بصیرت و عبرت کے نئے دریچے بھی وا کر دیے، یہ کتاب بھی ان کی خدمات کے ایک طویل سلسلے کا زریں حصہ ہے، بیماری اور پیرانہ سالی کے باوجود ان کی یہ محنت دوسرے محققین کے لیے قابل رشک اور اس سے زیادہ لائق تقلید ہے، کتاب کے مباحث میں شاہجہاں پور کی تاریخ پر حافظ محمد اسماعیل مرادآبادی کی وہ مفصل تحریر ہے جو بقول ڈاکٹر شاہجہاں پوری اپنے موضوع پر ان کی نظر سے گزرنے والا پہلا مقالہ ہے جس کو

سننے والوں میں علامہ شبلی نعمانی بھی تھے، قریب ڈیڑھ سو صفحوں میں شاہجہاں پور کی تاسیس، تعمیر، محلے، عمارتیں، سماجی زندگی غرض ہر پہلو روشن ہوگیا ہے، دوسرا حصہ روہیل کھنڈ اور ۱۸۵۷ء کے متعلق چند بہترین مضامین کا مجموعہ ہے، ان میں خورشید مصطفیٰ رضوی، ایوب قادری، غلام رسول مہر، عابدہ سمیع الدین معروف ہیں لیکن مولوی صبیح الدین شاہ جہاں پوری ڈی انگلس وغیرہ کی تحریریں اب کس کے علم میں ہیں، اسی طرح تیسرے اور چوتھے حصے میں شاہجہاں پور اور ۱۸۵۷ء کے واقعات پر کارآمد تحریریں یکجا کردی گئی ہیں اور فاضل مرتب نے ان سب کا خلاصہ یا عطر اپنے مقدمہ اور دوسری تحریروں میں اس سلیقے سے پیش کردیا ہے کہ حقیقتیں خود بخود سامنے آجاتی ہیں، آزادی کی تحریکوں میں حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کی تحریک اصلاح و جہاد کے متعلق انہوں نے واضح کیا کہ بالاکوٹ کے مقام پر احیائے ملت اسلامیہ کی تحریک ختم نہیں ہوئی، خاتمہ صرف مجاہدین کی ایک جماعت کے شہید اور نظام کے ٹوٹ جانے کو کہا گیا ہے لیکن تحریک کی روح کبھی فنا نہیں ہوئی، یہ اپنی فکر اور مقاصد کے لحاظ سے اس طرح باقی رہی کہ یہ برطانوی سامراج کے لیے ہمیشہ دردسر بنی رہی۔ فاضل مرتب نے غدر کی اصطلاح پر بھی صحیح اعتراض کیا کہ جن بزرگوں کو ہندوستان کے اس قومی انقلاب کو غدر کہنے پر اصرار ہے ان کے سامنے پلاسی، میسور، بالاکوٹ، روہیل کھنڈ اور اودھ کی تاریخ ہوتی تو اس جنگ آزادی کا حقیقی پس منظر ان کی زبان سے غدر کا لفظ نہ کہلاتا۔ ایک اور خوبی یہ ہے کہ فاضل مرتب نے آزادی کی تحریک میں انقلابیوں کی کامیابی اور ان کے ذریعہ قائم ہونے والے انتظامیہ کی انتظامی صلاحیتوں کو بھی نمایاں کیا، ان کی نظر میں یہ منظّم حکومتیں تھیں اور بلند مقاصد کے لیے قائم کی گئی تھیں، یہ بدقسمتی ہے کہ وسائل کی کمی، عدم تعاون اور سب سے بڑھ کر اپنوں کی سازشوں سے ان کو دیرپا کامیابی نہیں ملی، کتاب میں ضمیمہ کے طور پر تواریخ شاہ جہاں پور پر ایک تنقیدی تبصرہ صبیح الدین خلیل شاہ جہاں پوری کا اور دوسرا حافظ مطیع اللہ خاں کا شامل ہے، یہ دونوں تبصرے اب کم یاب ہیں، اس لیے ان کی موجودگی سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا، مجلس یادگار شیخ الاسلام پاکستان نے اس اشاعت کے ذریعہ ملک وملت کی تاریخ کے شائقین کے لیے ایک بہترین تحفہ مہیا کردیا۔

ع-ص

رسید کتب

۱- The Simplified Qur'n Part 30: By Sayyid Hameed Abdur Rahman Alkaf, Sub-Dept Markazi Maktaba Islami Chatta Bazar, Hyderabad, قیمت: ۱۸۰ روپے

۲- پھول کھلتے ہیں خزاں میں بھی: صغیر احمد صغیر، شاہ گنج پریس، کراچی۔ قیمت: ۷۵ روپے

۳- جنوبی ہند کا ایک علمی وادبی سفر: پروفیسر احمد سجاد، تاج بک ڈپو، مین روڈ رانچی-۱۔ قیمت: ۲۰۰ روپے

۴- علامہ عبدالحئیؒ لکھنوی فرنگی محلی، حیات وخدمات: ڈاکٹر ولی الدین ندوی، ترجمہ محمد رافع اعظمی، مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی، مظفر پور، اعظم گڑھ۔ قیمت درج نہیں

۵- قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی سے متعلق کچھ اہم مباحث: مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، ایفا پبلی کیشنز، بیسمنٹ ۱۶۱ ایف، جوگا بائی، جامعہ نگر نئی دہلی۔ قیمت: ۱۴۰ روپے

۶- متاع علم وفکر: مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، ایفا پبلی کیشنز، بیسمنٹ ۱۶۱ ایف، جوگا بائی، جامعہ نگر نئی دہلی۔ قیمت: ۱۸۰ روپے

۷- نثار احمد فاروقی: ثاقب عمران، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ قیمت: ۶۰۰ روپے

۸- ہندوستان میں اسلامی صحافت کی تاریخ اور ارتقاء: ڈاکٹر سلیم الرحمٰن خان ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔ قیمت: ۲۵۰ روپے

۹- ہندوستان اور علم حدیث تیرہویں اور چودھویں صدی ہجری میں: مولانا فیروز اختر ندوی، مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی، مظفر پور، اعظم گڑھ۔ قیمت درج نہیں

۱۰- ہنس راج رہبر کے افسانے (کلیات): نند کشور وکرم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ قیمت: ۲۸۵ روپے